سیرتِ پاک کے موضوع پر نشری تقریروں کا مجموعہ

سیّد انسانیت

(صلی اللہ علیہ وسلم)

نعیم صدیقی رح

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

فہرست

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ

کلماتِ مؤلف

بعض اتفاقات عجیب ہوتے ہیں۔ تین سال پہلے بھارت سے غالباً ریڈی انیس کے مینیجر سید حسین آ کر ملے اور باتوں باتوں میں مجھے مشورہ دیا کہ محسنِ انسانیت کا ایک مختصر ایڈیشن بھی تیار ہونا چاہیئے۔ میں نے سرسری طور پہ کہا کہ اچھا کبھی وقت ملا تو کوشش کروں گا۔ اس کے دو تین ہی دن بعد اللہ تعالیٰ نے مجھ سے اس کام کا آغاز کرا دیا۔

رمضان ۱۳۹۸ھ کے لیے ریڈیو پاکستان لاہور کی طرف سے تقاضا ہوا کہ "محسنِ انسانیت" کا مؤلف اسی عنوان سے ۳۰ تقریروں میں سیرتِ پاک بیان کرے، یعنی ہر روز ایک تقریر۔ میں نے خدمتِ دین و ملّت کے جذبے سے اپنی شدید مصروفیات کے باوجود اس مہم کو بھی سر کیا کہ ہر روز تقریر تیار کرتا، پھر ریڈیو اسٹیشن جا کر ریکارڈ کراتا، پھر نشری تقریر کو خود سنتا۔ بلکہ ایک دن تو دیر ہو جانے کی وجہ سے براہِ راست تقریر نشر کی۔

اچھا ہوا کہ ان تقاریر کے مسودوں کی نقلیں میں رکھتا رہا۔ مگر مرتب کرنے کے لیے پھر وہی انتظار کہ کبھی فرصت ملے تو کچھ کروں گا۔ مگر فرصت کبھی نہ ملی، یہاں تک کہ اب تین سال سے زیادہ عرصہ گذر گیا ہے۔ اب جب میرا تعلق ادارہ معارف اسلامی سے بہ حیثیت ڈائریکٹر قائم ہوا تو ادارے کے انچارج جناب خلیل حامدی صاحب سے دورانِ گفتگو یہ بات طے ہو گئی کہ میں سیرت کی نشری تقریریں المنار بک سنٹر کے لیے مرتب کر دوں۔ ہوتے ہوتے ترتیب و نظرِ ثانی کا کام بھی آخر ہو ہی گیا۔ اب یہ مجموعہ پیشِ خدمت ہے۔ واضح رہے کہ نشر شدہ تقاریر میں ترامیم کی گئی ہیں۔ اضافے بھی ہیں اور تقاریر کی تعداد بھی بڑھ گئی ہے۔

دوسرے مذاہب کے خلاف ہمارے دین میں ایک حرکت و حرارت ہے۔ یہ راز جب میں نے پورے قرآن کے مطالعہ سے پالیا تو پھر میں نے سیرت پہ نگاہ ڈالی اور محسوس کیا کہ حضورؐ محسنِ انسانیت محمدؐ مصطفیٰ کی ہستی بہ حیثیت شاہد و مجاہد جو شان رکھتی ہے اور جس کی دعوت و تعلیم نے اہلِ عرب کے جمود کو توڑ کر حیاتِ تازہ کا ایک دریا بہا دیا تھا، ہمارا فنِ سیرت نگاری و سیرت بیانی اُسے صحیح طور پر پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ علمی تحقیق کے لحاظ سے اور والہانہ عقیدت و ایمان کے لحاظ سے اکثر و بیشتر سیرت نگار (خصوصاً اسلاف) مجھ سے بہت آگے ہیں۔ مگر کمی یہ رہ جاتی ہے کہ اُس نور و حرکت و حرارت کا طوفان حضورؐ کی سیرت پڑھنے، سننے والوں کی طرف منتقل نہیں ہوتا جو انہیں بھی جمود کی قید سے نکال کر متحرک کر دے۔

بس مرکزی مقصد یہی تھا "محسنِ انسانیت" کو لکھنے کا۔ مگر محسنِ انسانیت ایک بڑی کتاب بن گئی۔ ویسے تو وہ بڑی کتاب نہیں، بلکہ ایک جلد تک محدود ہونے کی وجہ سے اسے مختصر سیرت ہی کہا جا سکتا ہے۔ مگر موجودہ گرانی کے دور میں ساڑھے چھ سو صفحات کی ایک کتاب خریدنا بہت سے لوگوں کے لیے مشکل ہے، خصوصاً نوجوان طلبہ اور غریب عوام کو سامنے رکھتے ہوئے زیادہ مختصر ایڈیشن کی ضرورت تھی۔ سو یہ مختصر ایڈیشن حاضر ہے۔ میں اسے ریڈیو پاکستان کے شکریے کے ساتھ ادارہ کے حوالے کرتا ہوں۔ دارہ

پڑھنے والوں کے لیے میں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے ان کو سیرتِ پاک کا صحیح فہم عطا کرے۔ جواباً وہ میرے لیے دُعا کریں کہ وہ میری سعی کو قبول فرمائے اور لغزشوں سے درگزر فرمائے۔

درخواست یہ بھی ہے کہ قارئین اس کتاب کی جن غلطیوں سے آگاہ ہوں ان سے مجھے آگاہ کریں۔ ○○

نیاز کیش

نعیم صدیقی۔ نومبر ۱۹۸۱ء

تقریر ۱

سیرتِ پاک اور محمدی انقلاب

حضور نبیٔ پاک محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کوئی قصّہ کہانی نہیں ہے، وہ محض ایک فرد کی داستان بھی نہیں ہے، بلکہ وہ فی الحقیقت ایک ایسے عظیم اور پاکیزہ انقلاب کی کہانی ہے جس کی کوئی مثال تاریخِ انسانی میں نہیں ملتی۔ اس انقلاب کی روداد کا مرکزی کردار نبی اکرمؐ کی شخصیت ہے۔ باقی کے تمام کردار، خواہ وہ ابوبکرؓ و عمرؓ ہوں یا عثمانؓ و علیؓ، جعفرؓ طیار ہوں یا سید الشہدا جنابِ حمزہؓ، وہ حضرت بلالؓ ہوں یا یاسرؓ و عمارؓ اور اسی طرح دوسرے محاذ پر ابوجہل ہو یا ابولہب، عبداللہ بن اُبَی ہو یا کعب بن اشرف، خواتین میں سے حضرت خدیجہؓ ہوں یا جنابِ فاطمہؓ، حضرت عائشہؓ ہوں، یا جناب ام المساکینؓ اور ان کے مقابل میں زوجۂ ابولہب ہو یا ہندہ جگر خوار ـــــ یہ سب کے سب مرکزی کردار کے یا تو معاون کردار ہیں، یا مخالف۔ ان مختلف کرداروں کے تعاون اور کشمکش کے نتیجے میں تاریخ کا وہ سنہری باب لکھا گیا جس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آنحضورؐ کی سیرتِ پاک رچی بسی ہوئی ہے اور مہاجرین و انصار میں اسی کا انعکاس

دکھائی دیتا ہے۔ حضورؐ کی سیرت کو اس کشمکش سے الگ کر کے سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔

نعوذ باللہ حضورؐ نہ تو تارک الدنیا راہب تھے اور نہ ایک محدود اور بے ضرر سا دھرم یا مت سکھانے آئے تھے۔ آپؐ کے ذمّے محض پوجا پاٹ کے طریقے بتانے اور چند اخلاقی نصیحتیں اور سفارشیں کرنے کا کام نہ تھا، بلکہ قرآن کی توضیحات کے مطابق آپ کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ خدا پرستانہ حکمت اور پاکیزہ اخلاق سے آراستہ کر کے آپؐ ایک ایسی جماعت کھڑی کریں۔ جو آپؐ کی قیادت میں بھرپور جدوجہد کر کے دینِ برحق کو ہر دوسرے نظریے اور فلسفے اور مذہب کے مقابلے میں پوری انسانی زندگی پر غالب کر دے: ویکون الدّین کلہٗ للّٰہِ!

بات کو سمجھنے کے لیے دو تین مواقع پر رسولِؐ برحق کے فرمائے ہوئے کلمات پر ہم نگاہ ڈالتے ہیں۔ ان کلمات کی شہادت یہ ہے کہ حضورؐ کو اپنے کام کے حوصلہ شکن ابتدائی دور میں پورا شعور تھا کہ کیا کرنے چلے ہیں۔ دعوت کا کام شروع کرنے کے جلد ہی بعد خاندانِ بنو ہاشم کو کھانے پر جمع کیا اور اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ "جو پیغام میں تم تک لایا ہوں اسے اگر تم قبول کر لو تو اس میں تمہاری دنیا کی بہتری بھی ہے اور آخرت کی بھلائی بھی"۔ پھر ابتدائی دورِ کشمکش میں مخالفین سے آپ نے فرمایا کہ "بس یہ ایک کلمہ ہے، اسے اگر مجھ سے قبول کر لو تو اس کے ذریعے تم سارے عرب کو زیرِ نگین کر لو گے اور سارا عجم تمہارے پیچھے چلے گا"۔ پھر ایک موقع پر رسولِ بشیر و نذیر کعبہ کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے، خباب ابن الارت نے جو قریش کے تشدد کا نشانہ بن رہے تھے، عرض کیا حضورؐ، ہمارے لیے خدا کی مدد کی دعا نہیں فرمائیں گے؟ حضورؐ نے جواب دیا کہ تم سے پہلے ایسے لوگ ہو گزرے ہیں کہ گڑھے کھود کر ان کے دھڑ مٹی میں داب دیے جاتے اور پھر ان کے سروں پر آرے چلا کر ان کو دو ٹکڑے کر دیا جاتا۔ تیز لوہے کی بڑی بڑی کنگھیوں سے بحالتِ زندگی ان کے گوشت اور کھالوں کی کترنیں ہڈیوں سے نوچ لی جاتیں لیکن یہ چیزیں ان کو دین و ایمان سے نہ پھیر سکیں۔ پھر فرمایا کہ "خدا کی قسم! اس کام کو اللہ تعالیٰ ایسی تکمیل منزل تک پہنچائے گا کہ ایک سوار صنعاء سے حضر موت تک تنہا سفر کرے گا، اور

اسے سوائے خدا کے کسی کا خوف لاحق نہیں ہوگا۔" مدنی دور میں عدی بن حاتم سے فرمایا کہ "بخدا وہ وقت قریب آرہا ہے جب تو سن لے گا کہ اکیلی عورت قادسیہ سے چلے گی اور مکّہ کا حج کرے گی اور اسے کسی کا خوف ڈر نہ ہوگا۔" ان کلمات سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کے سامنے اخوّت و مساوات، عدل و انصاف اور امن و سلامتی کے ایک ایسے نظام کا نقشہ تھا جس میں کمزور اور تنہا فرد بھی ہر ضرر اور ظلم سے محفوظ ہوگا۔

یہ تھی منزل جہاں تک پوری انسانیت کے قائد صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے اس معاشرے کو پہنچانے کے لیے عمر بھر جان ماری کی جو جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا، نظم سے محروم تھا، جرائم کی جولاں گاہ تھا، اور جس کے اجڈ اور اکھڑ لوگ آپس میں لڑ بھڑ کر قوتیں برباد کر رہے تھے۔

محمدی انقلاب کی اساس کلمہ طیبہ پر تھی، یعنی اس کائنات کا اور تمام نوعِ انسانی کا ایک ہی اِلٰہ[1] ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ پوجا صرف اُس کی ہوگی، حکم اور قانون صرف[2] اس کا چلے گا، حاجات اس سے مانگی جائیں گی، دعائیں اس سے کی جائیں گی، نذریں اس کے سامنے پیش کی جائیں گی، اعمال کا حساب کتاب لینے والا اور جزا سزا دینے والا وہ ہے، زندگی موت اور صحت اور رزق اور امن اور عزت سب کچھ اس کی طرف سے ہے۔ زندگی میں اور کوئی اِلٰہ نہ ہوگا، کسی بادشاہ کی، کسی حکمران کی، کسی خاندان کی، کسی دولت مند کی، کسی پروہت اور پادری کی، کسی نمبردار اور چودھری کی اور خود کسی شخص کے اپنے نفس کی خدائی بھی نہ چلے گی۔ اللہ کے سوا دوسرا جو کوئی بھی خدا بنتا ہے یا اپنی مرضی ٹھونستا اور اپنا قانون چلاتا ہے، یا دوسروں کے سر اپنے سامنے یا کسی اور کے سامنے جھکواتا ہے، یا جو لوگوں کی حاجات پوری کرنے کا مدعی بنتا ہے، وہ طاغوت کا پارٹ ادا کرتا ہے۔

اس انقلابی کلمے کا دوسرا جُز یہ بتاتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خُدا نے اپنا رسول مقرر کیا ہے۔ ان کو وحی کے ذریعے ہدایت اور ضلالت، نیکی اور بدی، حلال اور حرام کا

---

[1] سورہ البقرہ ۱۶۳ (دوسرے بے شمار مقامات) [2] البقرہ ۱۲۹

علم عطا کیا ہے۔ آپ خدا کی طرف سے قیامت تک تمام مسلمانوں کے پیشوا اور قائد، معلم[۱] اور مزکی اور اسوہ[۲] اور نمونہ قرار دیے گئے ہیں۔

اس انقلابی کلمے کے بیج سے نظامِ عدل و رحمت کا وہ شجرۂ طیبہ ظہور میں آیا جس کی شاخیں فضاؤں میں پھیل گئیں اور جڑیں زمین میں اُتر گئیں جس کی چھاؤں دُور دُور تک پھیل گئی اور جس کے فکری، تہذیبی اور اخلاقی برگ و بار کا کچھ حصہ ہر قوم اور معاشرے تک پہنچا۔

محمدی انقلاب کے حیرت انگیز پہلوؤں میں سے ایک یہ ہے کہ جس نے آپ کے پیغام کو قبول کیا اس کی ساری ہستی بدل گئی، اس کے ذہن کی ساخت، اس کے افکار و جذبات، اس کے ذوق اور دلچسپیاں، اس کی دوستیاں اور دُشمنیاں، اس کے اخلاقی معیارات سب کے سب بدل گئے۔ چور اور ڈاکو آئے اور دوسرے لوگوں کے اموال کے نگہبان بن گئے۔ زانی آئے اور دوسروں کی عصمتوں کے رکھوالے بن گئے۔ سود کھانے والے آئے اور وہ اپنی کمائیاں خدا کے دین اور بندوں کی خدمت کے لیے لٹانے لگ گئے۔ کِبر کے مجسّمے آئے اور عاجزی کا نمونہ بن گئے۔ خواہشوں کے غلام آئے اور پل بھر میں دنیا نے دیکھا کہ وہ اپنی خواہشوں کو روندتے ہوئے ایک اعلیٰ نصب العین کی طرف لپکے جا رہے ہیں۔ جاہل آئے اور آسمانِ علم پر اُنھوں نے اس طرح کمندیں ڈالیں کہ دنیا حیرت زدہ رہ گئی۔ اُونٹوں کے چرواہے انسانوں کے شفیق گلّہ بان بن گئے۔ لونڈیوں غلاموں کے پسے ہوئے طبقے سے وہ شجاع اور غیور ہستیاں نمودار ہوئیں جن پر دشمنوں نے ظلم و ستم کے سارے حربے آزما ڈالے، مگر ان کے ضمیروں کو بدلنے اور ان کے ایمانوں کو شکست دینے میں کامیاب نہ ہوئے۔

محمدی انقلاب کے ان رضاکار سپاہیوں میں ڈسپلن اور ضبط و نظم ایسا بے مثال تھا کہ حالتِ نماز میں اُن کو تحویلِ قبلہ کا حکم ملا تو اُنھوں نے فوراً اپنے رخ بیت المقدس سے کعبہ کی طرف پھیر لیے، اُن کے لیے شراب حرام کی گئی تو اُنھوں نے مُنہ کے ساتھ لگے

---

[۱] البقرہ ۱۲۹ [۲] الاحزاب ۲۱

ہوئے پیالے تک الگ کر کے پھینک دیے، ان کی خواتین نے جب رسولِ پاک کی زبان سے حکمِ حجاب سُنا تو اس میں مین میخ نکالنے کے بجائے فوراً اپنے سروں اور سینوں اور زینتوں کو ڈھانپ لیا۔ ان میں سے اگر کسی مرد یا عورت سے خدا اور رسولؐ کے احکام کے خلاف کوئی جرم سرزد ہو گیا تو اپنے جُرم کے اقراری بن کر خود پیش ہوئے اور اصرار کیا کہ ان پر سزا نافذ کر کے انہیں حضورؐ پاک کر دیں۔ اُن سے چندہ طلب کیا گیا تو کسی نے گھر کا سارا سامان لا کے مسجد میں ڈھیر کر دیا، کسی نے سامان سے لدے ہوئے اونٹوں کی قطاریں کھڑی کر دیں اور کسی مزدور نے دن بھر کی محنت کی کمائی ہوئی چند کھجوریں پیش کر دیں۔

پیغمبرِ آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بڑا احسان تہذیبِ انسانی پر یہ ہے کہ آپؐ نے انسانوں کے تمام رشتوں اور رابطوں کو محکم بنیادوں پر استوار کیا، ایک دوسرے کی باہمی ذمہ داریاں واضح کیں، سب کے حقوق و فرائض متعین کیے، اور اپنے نمونے کے معاشرے میں والدین اور اولاد، بھائی، بہنوں، میاں بیوی، استاد اور شاگرد، امیر اور غریب، پڑوسی اور ہمسفر، حاکم اور رعیّت کے ربط و تعلق کو احسن شکل دی۔

افراد کے اندر واقع ہونے والے اس انقلاب کے نتیجے میں عرب کے معاشرے میں جو انقلاب واقع ہوا وہ حیرت انگیز ہے۔ حضورؐ نے اسلامی ریاست کی بنیاد جب مدینہ میں رکھی تو زیادہ سے زیادہ وہ علاقہ سو مربع میل ہو گا۔ آٹھ نو سال کے قلیل عرصے میں یہ ریاست پھیل کر دس بارہ لاکھ مربع میل تک وسیع ہو گئی جس میں کوئی طبقاتی کشمکش نہ تھی۔ جس میں نسب کے فخر اور نسل کی عصبیت کا خاتمہ ہو گیا جس میں امیر و غریب اور عالم اور اَن پڑھ بھائی بھائی بن گئے، جس میں جرائم نہ ہونے کے برابر تھے جس میں لوگ ایک دوسرے پر ظلم کرنے والے، سرکاری مال اور فرائض میں خیانت کرنے والے اور رشوتیں سمیٹنے والے نہ تھے، جس میں ہر کوئی دوسرے کے کام آتا تھا اور اپنے بھائی کو سہارا دیتا تھا۔ یہ بالکل ایک نئی دُنیا کی تعمیر کی مُہم تھی۔

یہ پاک اور پیارا محمّدی انقلاب اس طرح نہیں آیا کہ لوگوں پر جبر و تشدّد کیا جا رہا ہو۔ اس انقلاب کا پیغام قبول کرانے کے لیے کسی کو قتل نہیں کیا گیا۔ کسی کو جیل میں

نہیں ڈالا گیا۔ کسی کی پیٹھ پر تازیانے نہیں برسائے گئے۔ اس کے لیے دہشت نہیں پھیلائی گئی بلکہ اس انقلاب کی روح محبتِ انسانیت تھی اور حضورؐ نے بڑی شفقت سے معلمانہ انداز پر پہلے مکہ میں ۱۳ سال تک اور پھر مدینہ میں دس برس تک کام کیا۔

مکہ کے دور میں آپؐ نے گالیاں سُن کر، طعن و طنز کا ہدف بن کر، مار کھا کر اور تین سال تک شعبِ ابی طالب میں خاندان سمیت نظر بند رہنے کے باوجود نرمی اور پیار سے دعوت دی اور آپؐ کے رفیق تپتی ریت پر لٹائے گئے۔ ان کے سینوں پر پتھر رکھے گئے، ان کی پیٹھوں کے نیچے دہکتے انگارے ٹھنڈے ہو گئے۔ کسی کے گلے میں رسّی ڈال کر گلیوں میں گھسیٹا گیا، کسی کو تازیانے مار مار کر ادھ موا کر دیا گیا اور کسی کو عذاب دے دے کر جان ہی لے لی گئی۔

پھر مدینہ میں آکر یہودیوں کی شرارتوں اور منافقین کی غداریوں کا سامنا کیا۔ یہاں تک کہ بار بار آپؐ کے قتل کی سازشیں کی گئیں جن سے حضورؐ بال بال بچ نکلے، مگر یہودیوں اور منافقوں کی ایک بڑی تعداد پوری آزادی کے ساتھ موجود رہی اور شرانگیزی کرتی رہی۔

میدانِ جنگ میں حضورؐ اگر مسلم قوت کو اتارنے پر مجبور ہوئے تو اس وجہ سے کہ مخالف جاہلی قوت کے علمبردار خود بار بار چڑھ کر آئے، بدر اور احزاب کی تین بڑی بڑی جنگیں مدینے کے دروازے پر لڑی گئیں۔ صرف ایک آخری جنگ جس کے پہلے مرحلے پر مکّہ اور دوسرے میں حنین و طائف مفتوح ہوئے اس وجہ سے ناگزیر تھی کہ دشمن کی جنگی قوت اور کارروائیوں کے یہ مراکز تھے۔ اگر انہیں قائم رہنے دیا جاتا، تو جنگوں کا یہ سلسلہ نہ جانے کب تک چلتا۔ اسی طرح غزوۂ بنو مصطلق اور غزوۂ خیبر کا مقصد خوفناک قسم کی غدارانہ اور سازشی کارروائیوں کا سدِّباب کرنا تھا۔ باقی چھوٹے موٹے معرکے یا تو ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے تھے یا سرحدی جھڑپوں کی نوعیت رکھتے تھے۔ کمال یہ ہے کہ جنگوں میں نبیٔ امن و رحمت نے ایک طرف ایسی تدبیریں اختیار کیں کہ دشمنوں کے کم سے کم افراد کو ہلاک کرنا پڑے، دوسرے عرصۂ پیکار کے لیے بھی اعلیٰ درجے

کے ضابطے نافذ کر کے دکھایا کہ خدا پرستوں کے انداز کیا ہوتے ہیں۔ ۹ سال کی تمام جنگی کارروائیوں میں دشمن کے ۷۵۹ افراد ہلاک ہوئے یعنی تقریباً ۸۴ افراد فی سال۔ اور جنگوں میں مسلمانوں کا کل جانی نقصان ۲۵۹ ہے۔ ۸، ۹ سال کی مدت میں دو طرفہ جنگی اموات کی میزان ایک ہزار اٹھارہ ہے۔

کیا دنیا کا، اور خصوصاً آج کی مہذب دُنیا کا کوئی انقلاب اتنے کم جانی نقصان کے ساتھ اتنے بڑے تغیر کی مثال پیش کر سکتا ہے؟ اس نام نہاد مہذب دنیا میں تو انقلاب ایک عفریت کی طرح آتا ہے اور ہزار ہا انسانوں کو لقمہ بناتا ہے، پھر انقلابی حکومتیں جبریت کے تخت پر بیٹھ کر لوگوں کو مسلسل قتل کرتی رہتی ہیں، جیلوں میں ڈالتی ہیں، ان کو عذاب دیتی ہیں اور برسوں خوف اور دہشت کی فضا طاری رہتی ہے۔ ان جبری اور خونریز انقلابوں نے تو انسان کی فطرت کو بالکل مسخ کر دیا ہے۔

محمدی انقلاب کی رحمت و برکت کو سامنے رکھ کر جب ہم دوسرے انقلابی نظریوں اور فلسفوں کو دیکھتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ باطل کے مختلف روپ ہیں۔

پس مطالعۂ سیرتِ نبویؐ سے ہمارا مقصود یہ ہونا چاہیے کہ ہم حضورؐ کے پیغام، حضورؐ کے ذکر و عبادت، حضورؐ کے اخلاق، حضورؐ کی تنظیم، حضورؐ کے کارنامے، حضورؐ کے طریقِ کار اور حضورؐ کی حکمتِ عملی کو سمجھ کر اپنے آپ کو اس امر کے لیے تیار کریں کہ پہلے ہمارے اپنے اندر محمدی انقلاب کا آغاز ہو اور پھر ہم نہ صرف اپنے ملک اور معاشرے کو، بلکہ پوری نوعِ انسانی کو محمدی انقلاب کی برکتوں اور سعادتوں سے بہرہ مند کریں۔ ہمارے لیے حق کی راہ صرف یہ ہے کہ حضورؐ کو اپنی ساری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے پیشوا قائد اور اسوہ اور نمونہ تسلیم کریں اور کسی دوسرے فلسفی یا انقلابی یا مصلح یا سیاست کار یا قانون ساز کو اپنا مستقل رہنما بنا کر اس کی پیروی نہ کرنے لگیں ورنہ تمام زندگی خدا کے ہاں رائیگاں شمار ہو گی۔

تقریر نمبر : ۲

حضورؐ کی ولادت اور قبلِ نبوت کا دَور

قبل اس کے کہ محسنِ انسانیت جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ورود و ولادت کا ذکر چھڑے، یہ شعور بھی ضروری ہے کہ آپؐ کی تشریف آوری کن حالات میں ہوئی۔ دُنیا میں کتنے حکمران اور فاتحین، فلسفہ طراز اور دانائے راز، واعظانِ شیریں مقال اور خطیبانِ آتش نوا، کتنے ہی بانیانِ مذاہب اور معلّمینِ اخلاق، مصلحین اور مقنّن پیدا ہوئے۔ لیڈر اٹھے جنہوں نے جماعتیں اور پارٹیاں بنائیں۔ طوفانی شخصیتیں اُبھریں جنہوں نے طرح طرح کے انقلاب برپا کیے۔ ہر ایک اس دعوے کے ساتھ آیا کہ وہ زندگی کی ساری گتھیاں سلجھا دے گا۔ ہر کسی کو زعم رہا کہ وہ انسانیت کو امن و خوشحالی اور خیر و فلاح کی دولت سے مالا مال کر دے گا، مگر ان ساری کوششوں کو ہم سرسری اور سطحی، وقتی اور جزئی حد تک اثر انداز ہوتا دیکھتے ہیں۔ پھر ان کوششوں سے کوئی خیر نمودار ہوا تو اس کے ساتھ شر نے بھی سر ابھارا، کچھ نیکیاں آئیں تو کچھ برائیوں نے بھی پیشقدمی کی، ہم جدھر بھی دیکھتے ہیں تاریخ میں حق و باطل، صدق و کذب، عدل اور ظلم اور حلال و حرام کے مرکبات پائے جاتے ہیں۔ ہاں ایک انبیائے مرسلین کی صف ایسی ہے جن کا

ہر فرد جب بھی اٹھا، صرف سچائی اور نیکی، اور پوری سچائی اور نیکی کو لے کر اُٹھا۔ اور یہ خصوصیت بھی صرف انبیا ہی کی ہے کہ جس نے اُن کی دعوت قبول کی اس کے اندرون سے تبدیلی رونما ہوئی، پھر اس کی ذات کے ساتھ ساتھ، اس کے گھر کی فضا، اس کے کاروبار کا راستہ، اس کے آمد و خرچ کا نقشہ، مختلف لوگوں کے ساتھ اس کے رویّے، سب کچھ بدل گیا۔

حضورِ پاکؐ نے جس دور میں زمین پر پہلی سانس لی، اُس وقت پوری انسانیت تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی، کہیں دورِ وحشت طاری تھا، کہیں شرک و بُت پرستی کی لعنت مسلط تھی۔ کہیں جنگ و جدل کا سلسلہ چل رہا تھا۔ مصر، ہندوستان، بابل اور نینوا اور چین اور یونان میں جیسی کچھ تہذیب بھی تھی وہ اپنی تمام شمعیں گُل کر چکی تھی۔ کنفیوشش اور مانی کی تعلیم دم بخود تھی۔ ویدانیت اور بدھ مت کے تصورات سربگریباں تھے۔ جسٹینن کا ضابطہ اور سولن کا قانون بے بس تھا۔ رومی اور ایرانی تمدنوں کی ظاہری چمک دمک کے باوجود بادشاہ خدا بنے ہوئے تھے۔ جاگیردار طبقوں اور مذہبی عناصر کی ملی بھگت قائم تھی۔ عوام سے بھاری ٹیکس اور رشوتیں اور خراج اور نذرانے وصول کیے جاتے تھے۔ اُن سے جانوروں کی طرح بیگاریں لی جاتی تھیں۔ دونوں سلطنتوں کی آپس کی جنگوں میں کبھی اِدھر کے لوگ پستے تھے، کبھی اُدھر کے لوگ کچلے جاتے تھے۔ ان کی کوئی آواز نہ تھی۔ وہ ظلم کے خلاف احتجاج نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے مسائل کا کوئی حل نہ تھا۔ اُن کی روحیں چیختی تھیں، مگر پکار کا کوئی جواب کسی طرف سے نہ ملتا تھا۔

خود عرب میں عاد و ثمود کے ادوار میں اور سبا اور عدن اور یمن کی سلطنتوں کے سائے میں کبھی تہذیب نے انگڑائی لی تھی، مگر اب ان تباہ شدہ قوموں کے آثار پر سناٹا طاری تھا۔ بقیہ عرب میں تمدّن کی صبح ابھی تک ظہور پذیر نہیں ہوئی تھی۔ ہر طرف انتشار تھا۔ جنگ و جدل اور لوٹ مار کا دَور دورہ تھا۔ شراب اور زنا اور جوئے سے ترتیب پانے والی جاہلی ثقافت زور پر تھی۔ قریش نے بت پرستانہ مذہبیت کے ساتھ کیسے

کی مجاوری کا کاروبار چلا رکھا تھا۔ یہود نے کتاب اللہ میں مسخ و تحریف کر کے کلامی اور فقہی موشگافیوں کی دکانیں چلا رکھی تھیں، مکّہ اور طائف کے مہاجنوں نے سود کے جال پھیلا رکھے تھے۔

یہ تھے بحرانی حالات جن کی طبق بر طبق تاریکیوں کے مقابلے میں قائدِ انسانیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم یکہ و تنہا بہت بڑی تبدیلی کا پیغام لے کر اُٹھے۔ آپؐ کی پیدائش مکّہ کے مقام پر ہوئی جو حضرت ابراہیمؑ کا قائم کردہ مرکزِ توحید تھا اور جہاں سے ایک بار پھر حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے مطابق دینِ ابراہیمی کا ابھار، خدا کے آخری نبیؐ کی محنتوں سے ہونے والا تھا۔

واقعہ فیل کے پچاس پچپن دن بعد ماہ ربیع الاوّل ۵۲ھ قبلِ ہجرت میں نوعِ انسانی کے نجات دہندہ جناب محمد مصطفےٰؐ کی ولادت ہوئی۔ تاریخ میں مختلف کیلنڈر رائج ہونے اور ان کے ادل بدل کی وجہ سے اختلاف ہوا ہے۔ کتابوں میں دو تاریخوں پر زیادہ زور ہے۔ ایک ۹ ربیع الاوّل بروز سوموار، دوسرا ۱۲ ربیع الاوّل۔ عیسوی کیلنڈر کے لحاظ سے ۲۰ تا ۲۲ اپریل ۵۷۱ء کا زمانہ قرار پاتا ہے۔ حضورؐ کا ظہور اُن کے والدِ مکرم حضرت عبداللہ کے گھر اور والدۂ محترمہ سیدہ آمنہ کی آغوش میں ہوا۔ آپؐ کی ولادت ہونے پر سارا گھر نور سے بھر گیا۔ حضورؐ کے دادا جناب عبدالمطلب آپؐ کو اُٹھا کر خانۂ کعبہ میں لے گئے۔ اور آپؐ کے لیے وہاں دعائیں کرتے رہے۔ دادا نے اپنے ایک خوابِ بشارت کی روشنی میں محمدؐ نام رکھا۔ فرمایا "میں چاہتا ہوں کہ میرا پوتا تعریف و توصیف حاصل کرے"۔ حضورؐ کی والدہ محترمہ نے آپؐ کا نام ایک رویائے صادقہ کی بنا پر احمدؐ رکھا۔ پس یہ دونوں نام حضورؐ کے ذاتی نام ہیں۔ دادا نے ساتویں دن قربانی دی اور تمام قریش کی ضیافت کی۔

آپؐ کے والدِ مکرم حضرت عبداللہ آپؐ کی ولادت سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ حضورؐ بحالت یتیمی پیدا ہوئے۔ حضرت عبداللہ کا قصہ یوں ہوا کہ آپؐ سیدہ آمنہ کے ساتھ نکاح ہونے کے بعد، رواج کے مطابق سسرال تشریف لے گئے۔ وہاں سے تجارت کے لیے شام چلے گئے۔ واپسی پر مدینہ میں قیام کیا تاکہ کھجوروں کا سودا کریں۔

یہیں آپ بیمار ہو گئے۔ حضرت عبدالمطلب کو جونہی اطلاع ملی، فوراً اپنے بڑے بیٹے کو ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔ مدینہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ جناب عبداللہ ایک ماہ بیمار رہ کر انتقال کر گئے ہیں اور نابغہ کے مکان میں دفن ہیں۔

ولادت کے بعد تین چار ماہ تک حضورؐ کی والدۂ محترمہ نے آپؐ کو دودھ پلایا۔ پھر آپؐ کے چچا ابولہب کی آزاد کردہ کنیز ثوبیہ کے دودھ پر پرورش ہوئی۔ رواج یہ تھا کہ مکّہ کے اشراف اپنے بچّوں کو رضاعت کے لیے دیہاتی علاقوں میں بھیج دیتے تھے تاکہ کھلی آب و ہوا میں پرورش پائیں۔ قبیلہ بنو سعد کی عورتیں سال میں دو دفعہ شیر خوار بچّے لینے کے لیے مکّہ آیا کرتی تھیں۔ اب کی جو گروہ آیا اس میں جناب حلیمہ سعدیہ بھی تھیں۔ تمام عورتوں نے اچھے کھاتے پیتے گھرانوں کے بچّے حاصل کر لیے تاکہ زیادہ انعام حاصل کر سکیں۔ حضورِ پاک چونکہ یتیم تھے، اس لیے کسی عورت نے اس گھر کی طرف توجّہ نہ کی۔ اتّفاق کی بات ہے کہ حلیمہ سعدیہ کو کوئی بچّہ نہ مل سکا اور خالی ہاتھ جانا بھی اس کے لیے رنجدہ تھا؛ چنانچہ وہ مکّہ کے اسی یتیم بچّے کی طرف مائل ہوئیں۔

خواتینِ بنو سعد کا قافلہ جب مکّہ سے روانہ ہوا تو تمام لوگ حیران رہ گئے کہ حلیمہ کی مریل سی سواری جو مکّہ آتے ہوئے پل کے نہ دیتی تھی اب اپنی برق رفتاری کی وجہ سے سب سے آگے آگے تھی۔ گھر پہنچنے کے بعد جلد ہی یہ حیرت ناک تجربہ پیش آیا کہ دبلی سی اونٹنی اور بکریوں کے دودھ میں اضافہ ہو گیا اور خود حلیمہ سعدیہ کا دودھ بھی اتنا بڑھا کہ اس کے اپنے بچّے اور نبیؐ پاک دونوں کی کفایت کرتا۔ گھر میں خوشحالی، برکت اور طمانیت کی فضا نمودار ہو گئی۔

حسبِ دستور دو سال بعد حلیمہ حضورؐ کو واپس سیدہ آمنہ کے پاس لائیں، مگر بچّے کو جُدا کرنا انہیں دل سے پسند نہ تھا۔ اتفاق سے مکّہ میں وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اس مصلحت سے سیدہ آمنہ نے بچّے کو واپس بھجوا دیا۔ چھ سال کی عمر میں حضورؐ اپنی والدہ کے پاس لائے گئے۔ آپ کی صحت بہت اچھی تھی، اخلاقی اٹھان خوب تھی، آپ

کی زبان میں فصاحت و بلاغت کا رنگ جھلک رہا تھا۔

کچھ ہی عرصہ بعد حضورؐ کو والدۂ مکرمہ مدینہ میں خاندان بنو نجار کے پاس لے گئیں جو حضورؐ کے دادا عبدالمطلب کے ننھال تھے۔ سیدہ آمنہ کا مقصدِ سفر اپنے خاوند کی قبر کی زیارت کرنا تھا۔ ایک ماہ تک مدینہ میں قیام رہا۔ واپس مکّہ آتے ہوئے جب آپ مقامِ ابواء تک پہنچیں تو آپ کی مہلتِ حیات ختم ہو گئی۔ وہیں تدفین ہوئی۔ ام ایمن حضورؐ کو لے کر مکّہ آئیں۔ اب حضورؐ کی کفالت کی پوری ذمّہ داری حضرت عبدالمطلب نے اپنے سر لی، مگر مشیتِ الٰہی یوں تھی کہ دو ہی سال بعد جناب عبدالمطلب نے بھی انتقال فرمایا۔ حکمتِ باری تعالیٰ آپ کو پے در پے صدموں سے گزار کر اور دنیوی سہاروں سے محروم کر کے اپنے کٹھن کام کے لیے تیاّر کر رہی تھی۔ جنابؑ عبدالمطلب نے مرتے وقت اپنے بہت ہی چہیتے پوتے کو جناب ابوطالب کے سپرد کر دیا اور جناب ابوطالب نے کفالت کا حق ادا کر دکھایا۔

جوانی کے دائرے میں قدم رکھنے تک یہ انوکھا بچّہ عام بچوں کی طرح کھلنڈرا اور شریر بن کر سامنے نہیں آتا، بلکہ بوڑھے داناؤں کی سی سنجیدگی سے آراستہ نظر آتا ہے، جوان ہوتا ہے تو انتہائی فاسد ماحول میں پلنے کے باوجود اُس کی جوانی بے داغ اور اس کی نگاہ بے آلائش رہتی ہے۔ معاشقے اور نظر بازی اور بدکاری جہاں نوجوانوں کے لیے سرمایۂ افتخار بنے ہوئے تھے وہاں وہ اپنے دامانِ خیال تک کو میلا نہیں ہونے دیتا۔ جہاں گلی گلی شراب کشید کرنے کی بھٹیاں لگی تھیں اور گھر گھر شراب خانے کھلے تھے اور جہاں اپنی بلا نوشیوں کے چرچے فخریہ قصیدوں میں کیے جاتے تھے، وہاں یہ نوجوان قسم کھانے کو بھی شراب کا ایک قطرہ تک کبھی اپنی زبان پر نہیں لیتا۔ جہاں قمار قومی مشغلہ بنا چلا آرہا تھا وہاں اس مجسمۂ پاکیزگی نے کبھی مہروں کو ہاتھ سے چھوا تک نہیں۔ جہاں داستان گوئی اور موسیقی کلچر کا لازمہ بنے ہوئے تھے وہاں یہ ہستی ہر قسم کے لہو و لعب سے کنارہ کش رہی۔ دو مرتبہ ایسے مواقع پیدا ہوئے بھی کہ یہ نوجوان رندانہ تفریحات کی مجالس میں جا پہنچا۔ لیکن جاتے ہی ایسی نیند طاری ہوئی کہ سمع و بصر

کا دامن پاک رہا۔ جہاں بتوں کی خدائی چل رہی تھی وہاں اس پاکیزہ مزاج ہستی نے غیر اللہ کے سامنے کبھی سر نہ جھکایا۔ ایک مرتبہ بتوں کے چڑھاوے کا جانور پکا کر لایا گیا تو اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ جہاں اولادِ ابراہیم نے کعبہ کا طواف حالتِ عریانی میں کرنے کی بدعت پیدا کر لی تھی وہاں اس حیادار نوجوان نے کبھی اپنے آپ کو لباس سے آزاد نہیں کیا۔ جہاں جنگ اور قتل روزمرّہ کا کھیل تھے وہاں احترامِ انسانیت کے اس علمبردار کے دامن پر خون کی ایک چھینٹ بھی نہ پڑی۔ حربِ فجار میں شرکت کی، مگر کسی انسانی جان پر خود ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اس پاک باز و عفیف نوجوان کی حقیقی دلچسپی کا آئینہ دار یہ واقعہ ہے کہ عنفوانِ شباب میں وہ اپنی خدمات ہم خیال نوجوانوں کی ایک اصلاح پسند انجمن کے حوالے کرتا ہے جو حلف الفضول کے نام سے غریبوں اور مظلوموں کی مدد اور ظالموں کی چیرہ دستیوں کے استیصال کے لیے قائم ہوئی تھی۔ اس مقصد کے لیے شرفا نے حلفیہ عہد باندھا۔

دورِ نبوت میں کئی سال بعد اس کی یاد تازہ کرتے ہوئے حضورؐ نے فرمایا کہ "اس معاہدے کے معاملے میں اگر مجھ کو سرخ رنگ کے اونٹ بھی دیے جاتے تو میں اس سے روگردانی نہ کرتا" —— نیز —— "آج بھی ایسے معاہدے کے لیے اگر کوئی بلائے تو میں حاضر ہوں۔"

اس نوجوان کی قائدانہ صلاحیتوں کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے کہ کعبہ کی تجدیدِ تعمیر کے موقع پر حجرِ اسود نصب کرنے کے معاملے میں جھگڑا ہو گیا، کیونکہ ہر قبیلہ یہ چاہتا تھا کہ اس پتھر کو اٹھا کر وہی نصب کرے۔ بات اتنی بڑھ گئی کہ تلواریں میانوں سے نکل آئیں۔ تقدیر کے اشارے سے اس قضیے کو چکانے کا شرف اسی نوجوان کے حصے میں آتا ہے۔ انتہائی جذباتی فضا میں سب کے اعتماد سے وہ جج بن کر فیصلہ کرتا ہے اور ایک چادر بچھا کر پتھر کو اس کے درمیان میں رکھ کر تمام قبیلوں کے افراد کو دعوت دیتا ہے کہ سب مل کر اس چادر کو اٹھائیں۔ چادر جب موقع تک پہنچ جاتی ہے تو وہ پیارا نوجوان حجرِ اسود کو اٹھا کر اس کی جگہ پر نصب کر دیتا ہے۔ جھگڑا ختم، اور تمام چہرے

پر خوشی اور اطمینان!

کعبہ کے متولیوں اور مجاوروں کے درمیان پرورش پانے والا یہ نوجوان چڑھاووں اور نذرانوں سے پیٹ پالنے کی راہ نہیں نکالتا بلکہ تجارت جیسا پاکیزہ اور معزز مشغلہ اختیار کرتا ہے۔ سرمایہ اپنے پاس نہیں ہے تو دوسروں کے سرمائے سے تجارت کرتا ہے اور دو مرتبہ سفر کر کے شام تک جاتا ہے۔ سائب، قیس بن سائب مخزومی اور حضرت خدیجہؓ اور دوسرے لوگوں کو ایک نوجوان کی کاروباری دیانت کا جب تجربہ ہوا تو سب نے تاجر امین کا لقب دیا۔ خصوصاً حضرت خدیجہؓ کو تو آپؐ کی طرف سے دیانت کے ساتھ ساتھ برکت کو دیکھنے کا موقع ملا تو مکّہ کی اس دولت مند نیک خاتون کے دل میں کشش بڑھ گئی۔

پھر یہ نوجوان رفیقۂ حیات کا جب انتخاب کرتا ہے تو مکّہ کی نوعمر، شوخ و شنگ لڑکیوں کو ایک ذرا سا خراج نگاہ دیے بغیر زیادہ عمر کی ایک بیوہ خاتون حضرت خدیجہؓ کو پسند کرتا ہے۔ پسند کا معیار یہ ہے کہ وہ خاندانی شرف اور ذاتی سیرت و کردار کے لحاظ سے نہایت اشرف خاتون ہیں۔ ان کا لقب طاہرہ تھا۔ یہ انتخاب گواہی دیتا ہے کہ اس نوجوان میں ہوسناکی کا شائبہ تک نہ تھا۔

پھر یہ یکتائے زمانہ نوجوان گھر بار کی دیکھ بھال، تجارت و دنیوی معاملات کی گوناگوں مصروفیات سے فارغ ہو کر جب کبھی کوئی فرصت کا وقت نکالتا ہے تو اسے تفریحات و تعیشات میں صرف نہیں کرتا، کوچہ گردی اور گپ شپ میں کوئی لمحہ نہیں گنواتا، بلکہ سارے جھمیلوں سے الگ ہو کر غارِ حرا کی خلوتوں میں خدائے واحد کی عبادت کرتا ہے، کائنات کی حقیقتوں اور انسانی زندگی کے صلاح و فساد پر غور کرتا ہے اور اپنی قوم اور انسانیت کو قعرِ مذلّت سے نکالنے کی تدبیریں سوچتا ہے۔ روایات بتاتی ہیں کہ حضورؐ کئی کئی روز کے لیے ستّو اور پانی لے کر غار میں جا بیٹھتے اور ذکر اور فکر میں محو رہتے۔ ۴ گز طول اور پونے دو گز عرض کا یہ غار مکّہ سے تقریباً ۳ میل کے فاصلے پر آج بھی موجود ہے۔

تقریر نمبر ۳

صُبحِ نبوت کا طلُوع

ایک دن ایسا ہوا کہ آپ غارِ حرا میں مصروفِ عبادت تھے، ربیع الاوّل کا مہینہ تھا اور اس کی ۹، تاریخ۔ یکایک ایک فرشتہ نمودار ہوا۔ یہ حضرت جبریلؑ تھے۔ جبریلؑ نے حضورؐ کو مخاطب کر کے کہا "محمدؐ! بشارت قبول فرمایئے، آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور میں جبریلؑ ہوں۔" یہ پہلا تعارف تھا۔

وحی کی باقاعدہ آمد اور نزولِ قرآن کا آغاز ۶، ماہ بعد ہوا۔ اُس دن جبریلؑ نے پاس آکر کہا "پڑھو" (اِقْرَاْ) آپؐ نے فرمایا، میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس پر حضرت جبریلؑ نے آپ کو ساتھ لگا کر زور سے بھینچا، پھر کہا کہ "پڑھو۔" آپ نے پھر وہی جواب دیا۔ جبریلؑ نے پھر بھینچا۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی، غرض تیسری مرتبہ جبریلؑ نے سورۂ علق کا ابتدائی حصّہ پڑھا، حضورؐ ساتھ ساتھ پڑھتے گئے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِی خَلَقَ ہ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ہ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِی عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ہ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (علق۔ ۱تا۵)

ترجمہ: اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے (سب کچھ) پیدا کیا۔ انسان کی جمے ہوئے خون

سے تخلیق کی۔ پڑھ، اور تیرا رب بڑا ذی شان ہے، جس نے قلم کے ذریعے (علم) سکھایا، اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

یوں صبحِ نبوت نمودار ہوئی۔ سورۂ علق کی یہ آیات نورِ وحی کی پہلی کرنیں تھیں۔ اُس دن حضورؐ کی عمر ۴۰ سال ۶ ماہ ۱۰ دن تھی اور رمضان سنہ ۱ میلادی کی ۱۸ ویں تاریخ!

قائدِ انسانیت، نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے بارے میں روایات بتاتی ہیں کہ فریضۂ نبوت تفویض ہونے سے سات برس پہلے ہی سے آپ کو سچّے خواب آنے لگے۔ جو کچھ خواب میں دیکھتے بعینہٖ وہی کچھ عالمِ واقعہ میں پیش آجاتا۔ کبھی ایک روشنی نگاہوں کے سامنے نمودار ہوتی۔ کبھی راستہ چلتے چلتے کسی درخت سے نام پکار کر السلامُ علیکم کہنے کی آواز آتی۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ آپ کو آنے والے ماحول سے مانوس کیا جائے۔

اس کے باوجود جبریلؑ کے سامنے آنے اور نبوت کی ذمہ داری خدا کی طرف سے سونپنے اور ساتھ لگا کر حضورؐ کو بھینچنے کے واقعات سے آپؐ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ فوراً غارِ حرا سے گھر تشریف لائے۔ آپؐ پر گویا جلالِ الٰہی کا پرتو پڑ رہا تھا۔ آتے ہی حضرت خدیجہ طاہرہؓ سے فرمایا کہ مجھے کچھ اوڑھا دو۔ طبیعت کا اضطراب جب کچھ کم ہوا تو اپنی نیک نہاد رفیقۂ حیات کو بتایا کہ میں ایسے واقعات سے دوچار ہو رہا ہوں کہ مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہے، آخر یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے تسلّی دی کہ آپ کوئی ڈر محسوس نہ کریں، مجھے معلوم ہے کہ آپ مصیبت زدوں کے ہمدرد، بے کسوں کے دستگیر ہیں، اقربا سے شفقت کا سلوک کرتے ہیں، ہمیشہ سچ بولتے ہیں، مہمان نوازی فرماتے ہیں، بیواؤں اور یتیموں پر رحم کرتے ہیں، خدا آپ کو کبھی مبتلائے اندوہ نہیں کرے گا۔

لیکن خود حضرت خدیجہؓ بھی صورتِ واقعہ کی تفصیل معلوم ہونے سے دل ہی دل میں متفکّر ہو گئیں اور اپنے اطمینان کے لیے آپ کو ساتھ لے کر اپنے چچیرے بھائی وَرَقہ بن نَوفل کے پاس پہنچیں۔ حضرت خدیجہؓ نے بات چھیڑی اور حضورؐ نے اپنی پوری سرگزشت

بیان کر دی۔ وَرَقَہ بن نَوفَل نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ وہ عالم تھا اور پچھلے مذہبی نوشتوں کا مطالعہ کرتا تھا۔ بات سُنتے ہی اُس نے کہا: "یہ وہی ناموسِ اکبر ہے جو موسیٰؑ پر اترا تھا۔ کاش میں جوان ہوتا اور اس وقت تک زندہ رہتا جب آپ کی قوم آپ کو یہاں سے نکال دے گی۔"

یہ سُن کر حضورؐ نے ورقہ بن نوفل سے پوچھا: "کیا قوم مجھے نکال دے گی؟" وَرَقَہ نے جواب دیا: "ہاں اس دنیا میں جس کسی نے ایسی تعلیم پیش کی اور بھٹکنے والوں کو راہِ راست پر لانا چاہا، اس کی مخالفت ہوتی رہی ہے۔ کاش آپ کی ہجرت تک میں زندہ رہوں اور آپؐ کی کوئی خدمت کر سکوں۔"

آغازِ نزولِ قرآن کے ساتھ ہی جبریلؑ امین نے حضورؐ کو وضو کر کے نماز پڑھنا سکھایا۔ پہلے جبریلؑ نے وضو کر کے دکھایا، پھر نبی اکرمؐ نے اسی طریق سے وضو کیا۔ حضرت جبریلؑ نے دو رکعت نماز پڑھائی اور حضورؐ نے اقتدا کی۔ اس موقع پر صرف دو رکعت فجر کی اور دو رکعت عصر کی نمازوں کو فرض کیا گیا۔ گویا نماز اوّلیں علامتِ اسلام اور اوّلیں فریضۂ اسلام قرار پائی۔

پیغمبرِ برحقؐ گھر تشریف لائے تو سب سے پہلے اسلام کی دعوت حضرت خدیجہ طاہرہؓ کو دی۔ اُنھوں نے اسلام قبول کیا، اور اس سعادت میں اُن کا پہلا نمبر ہے۔ جمعہ کے روز حضورؐ کے ساتھ حضرت خدیجہؓ نے پہلی نماز ادا کی۔ بعثت کے دوسرے دن حضرت علیؓ دس سال کی عمر میں اسلام لائے۔ پھر حضورؐ نے اپنے بچپن کے دوست حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، کو دعوت دی۔ بالغ مردوں میں سے حضرت صدیقؓ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ دوسروں نے تو کچھ نہ کچھ تأمّل کیا، مگر حضرت صدیقؓ نے کسی تأمّل کے بغیر فوراً سرِ تسلیم خم کر لیا۔ اُن کے ساتھ ہی حضورؐ کے غلام زید بن حارثہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ گویا عورتوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ، آزاد بالغ مردوں میں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ، لڑکوں میں سے حضرت علیؓ اور غلاموں میں سے زید بن حارثہ نے اوّلیت کا مقام حاصل کیا۔

یہ بھی حضورؐ کی صداقت اور اسلام کی حقانیت کی ایک دلیل ہے کہ آپؐ کی دعوت کو سب سے پہلے قریب سے جاننے والے چار نفوس نے قبول کیا۔ اگر کسی شخص میں یا اس کے پیغام میں کھوٹ میل ہوتا ہے، یا جہاں محض سوانگ رچایا جا رہا ہوتا ہے۔ وہاں گھر کے لوگ اور قریب سے دیکھنے والے افراد سب کچھ سمجھنے کی وجہ سے اوّل تو ساتھ دیتے ہی نہیں، اور اگر ظاہراً دیں بھی تو وہ سنجیدہ نہیں ہوتے: آگے پیچھے مذاق اڑاتے رہتے ہیں:

جماعتِ محمدؐی یا قرآنی اصطلاح میں حزب اللہ یا جدید اصطلاح میں تحریکِ غلبۂ دینِ حق کو جن مبارک ہستیوں نے اپنی پوری خدمات پیش کر دیں، ان میں ایک شخصیت ایسی بھی تھی جس کی مالی حیثیت مضبوط تھی، مکّے میں کپڑے کا کاروبار تھا، زمانۂ جاہلیت ہی سے اپنی اصابتِ رائے، اپنی پاکیزگیٔ کردار اور صدق و دیانت کی وجہ سے عرب کی اس مرکزی بستی میں وقار حاصل تھا۔ یہ تھے جناب ابوبکر صدیقؓ جن کے مال اور جن کی دانائی اور جن کے اثر و رسوخ سے تحریکِ غلبۂ اسلام کو بہت فائدہ پہنچا، نیز حضورؐ کے ان دیرینہ دوست کی ذاتی تبلیغ سے حضرت عثمانؓ بن عفّان، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت طلحہؓ اور حضرت سعدؓ بن ابی وقّاص مسلمان ہوئے۔

پیغمبر آخر الزّمان صلی اللہ علیہ وسلم کی خاموش دعوت نیک دل اور سلیم الطبع افراد کو چھانٹ چھانٹ کر اس طرح کھینچ رہی تھی جس طرح مقناطیس آہنی ذرّات کو اپنے ساتھ چمٹا لیتا ہے۔ عمّار آئے۔ خبّاب ابن الارتؓ آئے، ابو عُبَیدہ آئے، سعد بن زید آئے، عبیدہ اور جعفر بن ابی طالب آئے، عبداللہ بن مسعود اور ابو سلمہ آئے، عثمان بن مظعون اور صہیب رومی آئے (رضوان اللہ علیہم اجمعین) یہاں تک کہ حضرت اَرقمؓ نے بھی دعوتِ حق کی روشنی کے لیے سینہ کھول دیا۔ یہ وہ مبارک ہستی ہے جس کا گھر خفیہ دعوت کے دور میں قائدِ انسانیت اور آپؐ کے رفیقوں کا مرکز تھا۔

اِدھر خواتین میں حضرت خدیجہؓ کے بعد حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ کی اہلیہ محترمہ لُبابہؓ بنت الحارث، حضرت اسماءؓ بنت ابی بکر اور حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہؓ بنتِ خطّاب نے اسلام کی بارگاہ میں سر جھکا دیا۔

پہلے مرحلے میں دعوتِ محمدیؐ کو قبول کرنے والے مرد عورتوں کو السابقون الاولون کہتے ہیں۔ یہ وہ ہستیاں تھیں، جن کے سامنے دعوت کی کامیابی کے شواہد موجود نہ تھے، جنھیں کسی مفاد کے حصول کی توقع نہ تھی بلکہ اُلٹا وہ مشکلات و مصائب کے دور کو سامنے دیکھ رہے تھے۔ ان سابقونِ اولون نے دعوتِ حق کو محض حق ہونے کی بنا پر قبول کیا اور نبیٔ صادق و مصدوق کو محض ان کے پُرخلوص کردار اور کلامِ وحی کے انداز سے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ یہ وہ مبارک ہستیاں تھیں جنھوں نے بے جا ردوکد کی، نہ لمبی چوڑی بحثیں اُٹھائیں، نہ کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوئے، بلکہ یہ دورِ جاہلیت کی تاریکیوں میں اپنے اپنے درجے میں روشن کردار رکھتے تھے، یہ جاہلیت کے گندے جامد ماحول کے قفس کو توڑ کر نکلنے کے لیے اپنے اندر نامعلوم جذبات کی بجلیاں چھپائے ہوئے تھے۔ ان حضرات و خواتین کو جوں ہی ایک ایسی آواز سنائی دی جسے سن کر اُنھوں نے محسوس کیا کہ گویا یہ بھی ہمارے دلوں میں ہے، اور ساتھ ہی پکارنے والے پر نگاہ ڈالی اور اسے صادق و امین پایا تو فوراً لبیک کہا!

کسی معاشرے میں سچائی اور نیکی اور اصلاح و تعمیر کی آواز پر جو لوگ اوّلاً لبیک کہتے ہیں وہی معاشرے کا جوہر ہوتے ہیں۔ خود یہ بات نبوتِ محمدیہؐ کی حقانیت کی ایک شہادت ہے کہ سب سے پہلے اثر لینے والی ہستیاں ذہنی اور اخلاقی لحاظ سے عام سطح سے بلند تر تھیں۔

ہر دور میں، ہر درجہ و سطح پر اور ہر کام کے لیے سابقون اولون ہوتے ہیں اور دینِ برحق کی علمبرداری کے لیے جو لوگ پہلی صف میں جگہ پا لیتے ہیں، ان کو آخرت میں بھی سب سے آگے جگہ ملتی ہے، جیسے کہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ السابقون السابقون۔ اردو میں یوں کہیں گے کہ آگے والوں کی کیا بات ہے، وہ تو ہیں ہی آگے والے!

سورۂ علق کے ایک عرصہ بعد المدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ جن میں چھوٹے چھوٹے جملوں میں مختصراً جامع احکام دے گئے، مثلاً فانذر! اٹھو، اور ڈراؤ یعنی لوگوں کو گمراہی کے بُرے انجام سے ڈراؤ۔ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ۔ اپنا لباس پاک صاف رکھو۔

یعنی خدا پر ایمان لاکر اس کی بندگی اور اس کے دین کی اشاعت کرنے والوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ راہبوں کی طرح گندگی میں پڑے رہیں وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ۔ بتوں سے کنارہ کشی اختیار کرو وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ۔ زیادہ فائدہ اٹھانے کی نیت سے احسان نہ کرو۔ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ۔ اپنے رب کی خاطر یعنی اس کے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد میں صبر اختیار کرو۔ صبر اس معنی میں کہ جو بھی تکلیف اور نقصان اس راہ میں پیش آئے اسے حوصلے سے برداشت کرو اور صبر اس معنی میں بھی کہ دینِ برحق کے اصولوں پر، اس کے مقاصد پر اور اس کے خلاف ترغیب و ترہیب کے باوجود ڈٹے رہو۔ دین حق کے نقشے میں مصلحت کے تحت تبدیلیاں نہ پیدا کرو۔

مکہ کے ابتدائی دور میں قرآن کا جو تھوڑا سا حصہ نازل ہوا، اس میں جہاں ایک خوبی یہ تھی کہ مروجہ ادب، شاعری اور خطابت کے تمام معیارات کو اس نے پیچھے چھوڑ دیا۔ وہاں دوسری کشش دار بات یہ تھی کہ قرآن کی پکار جاہلیت کی بے تکی اور بھونڈی زندگی کے طویل، جامد دور سے اکتائی ہوئی طبیعتوں کے سامنے سوچنے اور عمل کرنے کی نئی راہیں کھول رہی تھی، پھر خدا کی وحدانیت اور اس کے حقوق اور صفات پر قرآنی آیات میں جو پُرزور استدلال موجود تھا اور اس کے ساتھ ایک غیر محسوس سی وجدانی اپیل شامل تھی، وہ کسی بھی سامع کو ایک بار پوری طرح متوجہ کر لیتی تھی۔ مزید یہ کہ قرآن نے آخرت فراموش مخاطبوں کے سامنے زندگی بعدِ موت کا نقشہ نہایت مؤثر انداز میں اس طرح کھینچا اور جزا و سزا کے ایسے مناظر ذہنوں کے سامنے اُجاگر کر دیے کہ سلیم الطبع انسانوں کے دل ہل جاتے تھے۔

دعوت دینے والی بے داغ شخصیت حضورؐ کی، اور پیرایۂ بیان قرآن کا۔ فضا میں سناٹا آخر کس طرح رہ سکتا تھا! جو لوگ اس آسمانی پیغام کو سن لیتے۔ ان کے دلوں میں مد و جزر پیدا ہو جاتا، انکے خیالات کی دنیا اتھل پتھل ہو جاتی، وہ ذہنی کشمکش سے دوچار ہو جاتے، اور چین اس وقت تک نہ آتا جب تک حضورؐ کے ہاتھ پر بیعتِ اسلام نہ کر لیتے۔

اس دور میں سارا زور انسانوں کے بنیادی طرزِ فکر کو بدلنے اور زندگیوں کی بنیاد

نئے عقائد کو بنانے پر تھا۔ نیا تصوّرِ کائنات۔ نیا تصوّرِ حیات۔ نیا تصوّرِ انسان۔ نیا تصوّرِ اخلاق۔ اور۔ نیا تصوّرِ تمدّن!!

خفیہ دعوت کے اس دور میں صرف قابلِ اعتماد سلیم الفطرت افراد سے رابطہ پیدا کیا جاتا۔ جو لوگ حضورؐ کے پیغام کو قبول کر کے جماعت محمدیہ میں داخل ہو جاتے وہ آنحضورؐ کے ساتھ کسی پہاڑ کی گھاٹی میں جا کر اخفا سے نماز ادا کرتے۔ اتّفاق سے ایک بار جناب ابوطالب کا اُدھر سے گزر ہوا اور اُنھوں نے نماز کا منظر دیکھ لیا۔ نماز کے بعد بھتیجے سے پوچھا "یہ کون سا دین ہے؟" حضورؐ نے فرمایا! یہ ہمارے دادا ابراہیم علیہ السّلام کا دین ہے۔ ابوطالب بولے! خیر میں اسے اختیار تو نہیں کر سکتا، لیکن تم کو اجازت ہے۔ کوئی شخص تمھاری مزاحمت نہ کر سکے گا۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ حضورؐ اور آپؐ کے رفقا کو کچھ مشرکین نے گھاٹی میں نماز ادا کرتے دیکھ لیا۔ پہلے حیران ہوئے، پھر بُرا بھی کہا، پھبتیاں کسنے لگے، کوئی جواب نہ ملا تو لڑنے پر اُتر آئے۔ اس دنگے میں ایک مشرک کی تلوار سے سعد بن ابی وقّاص زخمی ہوگئے اور خون بہنے لگا۔ یہ خوُن کی پہلی دھار تھی جس نے محمدّی انقلاب کی راہ میں زمین کو رنگین کیا۔ غنیمت ہوا کہ حضورؐ اور جملہ رفقا کی جانیں مشرکین کے جنونی ردِّ عمل کی زد سے بچ گئیں (۵)

تقریر نمبر ۴

علانیہ دعوتِ اسلام کا آغاز اور ردِّ عمل

خفیہ دورِ دعوت میں بھی اگرچہ محمدی تحریکِ انقلاب کی سُن گُن مشرکین کو تھی کیونکہ دو ایک واقعات نے اس کا کچھ چرچا پھیلا دیا تھا، مگر وہ یہ سمجھ کر دل میں مطمئن تھے کہ اسلام کے علمبرداروں میں کوئی بھی اُن کی صفوں کا بڑا لیڈر نہ تھا جو مذہبی اور قومی مناصب پر مامور ہو۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ چند نوجوانوں کا سر پھرا پن ہے، چار دن میں دماغوں سے ہوا نکل جائے گی۔ ہمارے سامنے کون دَم مار سکتا ہے۔ پھر قریش کا اعتقاد یہ بھی تھا کہ لات، مُنات، عُزّیٰ اور ہُبُل اور دوسرے بُت جن کے آگے ہم پیشانیاں رگڑتے ہیں اور چڑھاوے پیش کرتے ہیں، ہمارے ان دیوی دیوتاؤں کی مار ان پہ ایسی پڑے گی (نعوذ باللہ) کہ سارا ہنگامہ ختم ہو جائے گا۔

حضرت ابو ذرؓ بھی اسلامی تحریک کے خفیہ دور ہی میں ایمان لائے۔ آپ کا ترتیبی نمبر چھٹا یا ساتواں ہے۔ یہ بھی اُن مضطرب لوگوں میں تھے جو بُت پرستی سے کنارہ کر کے محض اپنی فطرت کی رہنمائی میں خدا کا ذکر اور اس کی عبادت کرتے۔ ان تک نبی اکرمؐ کی دعوت کی خبر پہنچی، اُنھوں نے بھائی کے ذریعے حالات معلوم کرائے۔ بھائی

نے حضورؐ سے آکر ملاقات کی، قرآن سُنا اور جو حالات معلوم ہوئے۔ ان کا خلاصہ حضرت ابو ذرؓ سے یوں بیان کیا کہ لوگ اُس شخص کو مرتد کہتے ہیں لیکن وہ مکارمِ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ عجیب کلام سُناتا ہے جو شاعری سے مختلف ہے۔ اس کے طور طریقے اس طرح کے ہیں جیسے تمہاری پسند ہیں۔ یہ اطلاع پاکر حضرت ابو ذرؓ آئے اور حضورؐ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ آدمی جوشیلے تھے، حرم میں جاکر اپنے اسلام کا اعلان کیا اور مار کھائی۔ یہ دورِ دعوت تین برس تک جاری رہا۔

لیکن مشیتِ الٰہی حالات کے سمندر کو بھلا اس طرح یخ بستہ اور پُرسکون کہاں رہنے دیتی ہے، خدا کی سُنت یہ ہے کہ بَلْ نَقْذِفُ الْحَقَّ عَلَى الْبَاطِلِ، ؎۱ یعنی وہ باطل کے خلاف معرکہ آرائی کے لیے حق کو اٹھا کھڑا کرتی ہے۔

یکایک دوسرے دورِ دعوت کے افتتاح کا حکم نازل ہوا کہ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ ؎۲ جو کچھ حکم دیا جارہا ہے، اسے واشگاف سُنا دیجیے۔

خدا کی طرف سے مامور شدہ محسنِ انسانیت (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی ساری قوتیں سمیٹ کر صبح صبح کوہِ صفا پر جا کھڑے ہوئے اور معاشرے کے معروف طریقے کے مطابق خطرے کا الارم کیا۔ بلند آواز سے پکارے "واصباحاہ" جس کا مطلب ہے: "ہائے صبح کی مصیبت!" قاعدہ یہ تھا کہ اس طرح کی پکار لوگ سُن کر سب کام چھوڑ چھاڑ کر پکارنے والے کے پاس جا جمع ہوتے تاکہ خطرے کا مقابلہ کریں۔ مکّے کے لوگ بھی کوہ صفا کے پاس جا جمع ہوئے اور پھر ہمہ تن گوش ہوگئے کہ نجانے کیا اطلاع ملنے والی ہے۔

حضورؐ نے بآوازِ بلند پوچھا: "کیا تم مجھ پر اعتماد کرتے ہو؟" جواب ملا: "ہاں کیوں نہیں" پھر پوچھا: "اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے سے ایک حملہ آور فوج آرہی ہے تو کیا مان لوگے؟" سب نے کہا، کیوں نہیں، ہم نے تمہیں ہمیشہ سچ بولتے ہوئے پایا ہے۔" تب حضورؐ نے فرمایا: "تو پھر میں یہ کہتا ہوں کہ خدا پر ایمان لاؤ، اے بنو عبدالمطلب! اے بنو عبدِ مناف! اے بنو زُہرہ! اے بنو تمیم! اے بنو مخزوم! اے بنو اَسد! ورنہ تم پر سخت عذاب وارد ہوگا۔" یعنی کوئی ظاہر فوج حملہ کرنے والی نہیں مشیت کی باطنی قوتیں

؎۱ الانبیاء ۱۸۔ ؎۲ الحجر ۹۴۔

اعلانِ جنگ کرنے والی ہیں۔ آپؐ کا چچا ابو لہب یہ سُن کر غصّے سے کہنے لگا: "غارت ہو جاؤ تم آج ہی کے دن۔ کیا یہی بات تھی جس کے لیے تم نے ہمیں یہاں بلایا؟" تمام لوگ بہت برہم ہو کر چلے گئے۔

دینِ اسلام کے نظامِ عدل و رحمت کے داعی نے دوسرا قدم یہ اُٹھایا کہ پورے خاندانِ عبدالمُطّلب کو کھانے پر بلوایا۔ اس مجلس میں حضرت حمزہؓ، حضرت عبّاسؓ اور جناب ابوطالب جیسے اہم افراد موجود تھے۔ کھانے کے بعد آپؐ نے مختصر سی تقریر کی۔ فرمایا: "میں جس پیغام کو لے کر آیا ہوں، یہ دین اور دنیا دونوں کا کفیل ہے۔ کون اس مہم میں میرا ساتھ دیتا ہے۔ جواب میں صرف حضرت علیؓ جن کی عمر ۱۳ برس ہو چکی تھی اُٹھے اور کہا کہ "میں ساتھ دُوں گا"۔ اس پر مجلس میں خوب قہقہہ لگا؟ گویا خاندانِ عبدالمطلب یہ کہہ رہا تھا کہ یہ دعوت اور داعی اور یہ لبیک کہنے والا کون سا کارنامہ انجام دے لیں گے۔ یہ تو ایک کھیل اور مذاق معلوم ہوتا ہے۔

اب تک جماعتِ محمّدی میں کلمۂ اسلام کی سربلندی کے لیے تقریباً ۴۰ افراد شامل ہو چکے تھے۔ یہ ایک محسوس قوّت بن چکی تھی۔ برسرِ عام دعوت دینے کے فرمانِ خداوندی کی تعمیل میں ایک دن آنحضورؐ نے حرمِ کعبہ میں کھڑے ہو کر توحید کا اعلان کیا۔ مشرکین نے شور مچا دیا کہ کعبہ کی توہین ہو گئی، اور مشتعل ہو کر چاروں طرف سے دوڑ پڑے۔ ہنگامہ برپا ہو گیا۔ توحید کا داعی گھیرے میں آگیا۔ شور و شغب سُن کر حارث بن ابی ہالہ، اُمّ ہالہ کے گھر سے حضورؐ کو بچانے کے لیے لپکے۔ ہر طرف سے تلواریں ان پر ایسی پڑیں کہ شہید ہو گئے۔ خدا کی راہ میں یہ تھا پہلا شہید، جس کے خون سے آنے والے دورِ تشدّد کے باب کی سُرخی تاریخ میں لگ گئی۔

بہر حال اب خدا کے رسولؐ نے گلی گلی جا کر فرد فرد تک اپنی بات پہنچانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ خدا کی ہستی کی طرف بلاتے، توحید کا سبق دیتے، شرک کے خلاف آواز اُٹھاتے، بتوں، پتھروں، درختوں اور جنّوں کی پوجا سے روکتے، بیٹیوں کو زندہ دفن کر دینے سے ہٹاتے، زنا اور جوئے اور شراب کی بُرائی بتاتے۔ پھر کبھی میلوں یا مجمعوں میں وعظ کہتے

ہوئے لوگوں کو تلقین فرماتے کہ دل کو بُرے خیالات سے، زبان کو گندی باتوں سے اور جسم اور لباس کو میل کچیل سے پاک رکھیں۔ نصیحت فرماتے کہ صرف ایک اللہ ہی تمام دنیا کا پیدا کرنے والا ہے۔ سورج، چاند، ستارے، انسان سب اسی کے پیدا کردہ اور محتاج ہیں۔ دعائیں قبول کرنے والا، رزق، صحت اور اولاد دینے والا اور مرادیں پوری کرنے والا تنہا وہی ہے۔ فرشتے اور نبی بھی اس کے احکام کے تابع ہیں۔ مرنے کے بعد ہر شخص کو اپنی زندگی کا حساب اس کے سامنے پیش کرنا ہے اور وہ اعمال کے مطابق جزا و سزا دے گا، کسی کو جنّت اور کسی کو جہنّم!

ماحول اس دعوت کو آسانی سے کیسے برداشت کر سکتا تھا، جس کے نتیجے میں مشرکانہ نظام کا سارا گٹھ جوڑ ٹوٹتا دکھائی دے رہا تھا۔ مذہبی ٹھیکیداری کی فیسیں اور مجاوری کے نذرانے اور سارے قبیلوں میں پھیلے ہوئے عہدے، سرداروں کی سرداریاں اور جزیرۂ عرب کی آبادیوں پر قریش کی خاص دھونس یہ سب کچھ ختم ہونے کا خطرہ سامنے تھا۔

مخالفین کی طرف سے پہلا ردِّ عمل پھبتیوں اور فقرے بازیوں اور گالیوں سے ہوا۔ کھری سچائی کا مقابلہ کرنے کے لیے باطل کا پورا اسلحہ خانہ استدلال کے اسلحے سے خالی تھا۔ کہا جانے لگا کہ اس شخص کی بات نہ سنو، یہ نعوذ باللہ صابی ہے، دین آبائی کو چھوڑ کر مرتد ہو گیا ہے۔ جہاں قرآن پڑھا جائے، خوب شور مچاؤ، سیٹیاں بجاؤ، تالیاں پیٹو، ورنہ ایمان خراب ہو جانے کا خطرہ ہے۔ ہائے رے ایمان والو! کیا مضبوط ایمان تھا تمہارا کہ دوسرے کی بات سنتے ہی وہ چور چور ہو جاتا۔

پھر آپؐ کے لیے ابن ابی کبشہ کا لقب تجویز ہوا۔ ابو کبشہ ایک بدنام شخصیت تھی۔ آپؐ کو اس کا فرزند یا پیرو کہا جانے لگا۔ پھر کہا گیا کہ یہ شخص تو دیوانہ ہو گیا ہے، اس پر بُتوں اور ٹھاکروں کی مار پڑی ہے، دورے پڑتے ہیں تو جھوٹ موٹ کے فرشتے نظر آنے لگتے ہیں۔ قرآن کی شہادت تو یہ ہے کہ بعضوں نے رُو در رُو بھی آپؐ سے کہا کہ "اے شخص تو مجنون ہے"[۱] پھر ساحری کا الزام لگایا جاتا کہ اس کی زبان سے دو لفظ سنتے ہی

---

[۱] الحجر

لوگ سحر زدہ ہو جاتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اجی کیا ہے، بس شاعری ہے، ادبی الفاظ کا نادر ہے، محمدؐ اوّل درجے کے آرٹسٹ ہیں؛ لسان خطیب ہیں، اس آرٹ سے کچے ذہن کے لوگ بہک جاتے ہیں۔ کہانت کا الزام بھی لگایا گیا کہ یہ تو وہی مشغلہ ہے جیسے کاہن لوگ چلّوں اور وظیفوں اور مراقبوں میں مصروف رہتے ہیں، فال گیری کرتے ہیں اور ایک ٹیکنیکل مجذوبانہ زبان میں غیب کے اسرار بیان کرتے ہیں۔ محمدؐ نے بھی ایسا ہی ڈھکوسلہ بنا رکھا ہے۔ ایسی باتوں کا ذکر اور جواب قرآن میں ساتھ کے ساتھ دیا جاتا رہا۔

دشمنانِ نبوت نے یہ اشتغلہ بھی کھڑا کیا کہ کوئی جن آکر نبی صاحب کو پڑھا سکھا جاتا ہے۔ دوسری طرف یہ شگوفہ چھوڑا کہ یمامہ میں کوئی شخص الرحمٰن نام کا ہے، وہ آکے خفیہ طور پر ساری باتیں نوٹ کرا جاتا ہے۔ تیسری بات یہ کہتے کہ کوئی عجمی استاد ہے جو باقاعدہ تعلیم دیتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ کوئی بیرونی طاقت مداخلت کر رہی ہے اور محمدؐ تو محض آلۂ کار ہے۔

باطل جب حق کے مقابلہ پر آتا ہے تو حق کی طرف سے ایک معاملے میں ایک ہی بات کہی جاتی ہے لیکن باطل نت نئی باتیں گھڑتا ہے، یہاں تک کہ ان میں سے بعض بالکل متضاد ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ چرچا ہونے لگا کہ محمدؐ کی تعلیم کیا ہے، بس اساطیر الاوّلین ہیں، پرانے لوگوں کے قصے کہانیاں، ہیں، زمانہ کہیں آپہنچا اور آج کے مسائل کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ سب قدامت پرستی اور رجعت پسندی تھی۔ مشرکین مکہ فی الواقع بڑے ترقی پسند تھے لیکن اس کے اُلٹ دوسری طرف وہ یہ اعتراض بھی کرتے کہ دیکھو جی، باپ دادا اور سارے بزرگوں کے طریقے چھوڑ چھاڑ کے نئی باتیں گھڑی جا رہی ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی عقل میں آنے والی باتیں ہیں کہ ایک خدا سارا انتظام چلا رہا ہے اور مرنے کے بعد جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔

سردارانِ قریش نے ایک اور تدبیر کی۔ مکہ کے شعرا کا ایک محاذ بنایا اور ابوسفیان بن حرث، عمرو بن عاص اور عبداللہ بن زِبَعری کو مامور کیا کہ وہ نبی اکرمؐ کے خلاف گندی ہجویہ نظمیں لکھ کر انھیں پھیلائیں۔ واضح رہے کہ اس دور میں شعرائے عرب کو پروپیگنڈا

کے لحاظ سے آج کل کے صحافیوں کا سا مقام حاصل تھا۔ مقصد یہ تھا کہ مسجع اور مقفی گالیاں دور دور تک پھیل جائیں۔ یوں سمجھئے کہ جیسے کسی شریف آدمی کے پیچھے کتے چھوڑ دیے جائیں۔

عاص بن وائل السہمی نے حضورؐ کے ہاں اولادِ نرینہ نہ ہونے کا طعنہ دیتے ہوئے یہ کہنا شروع کیا کہ چھوڑو بھائی، کس آدمی کے پیچھے پڑے ہو، وہ جس کے نہ باپ دادا ہیں نہ آگے اولادِ نرینہ۔ اِدھر آنکھ بند ہوئی اُدھر سارا کھیل ختم۔ اس کے جواب میں قرآن میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ کو کوثر عطا ہوا ہے، خیرِ کثیر آپؐ کے لیے مقدر ہے۔ دنیا میں آپ کی جانشین ایک عظیم المرتبہ اُمت ہو گی جو قرآن کے خزانۂ خیرِ کثیر کی محافظ ہو گی، اور آخرت میں حوضِ کوثر کے آپؐ ساقی ہونگے عظمت یہ نہیں کہ کسی کے بہت سے بیٹے ہونگے، عظمت یہ ہے کہ اس کے پیغام سے ہزارہا لوگ اپنی مشعلیں روشن کریں، اس کے کردار سے تا قیامت اخلاق تعمیر ہوتے رہیں، اور اس کے قائم کردہ نظام کی برکات سے ساری انسانیت بہرہ یاب ہو۔

چلتے ہوئے فقرے کسے جاتے کہ لوگو، ذرا دیکھو، یہ ہیں وہ صاحب جن کو نبی بنایا گیا ہے۔ خدا کو اگر کوئی نبی بنانا ہی تھا تو کیا بس یہی ہستی رہ گئی تھی۔ مکّہ اور طائف کے کسی ذی شان سردار کو کیوں نہ مامور کر دیا۔ حضورؐ کے رفقاء کو دیکھتے تو طعنہ دیتے کہ ملاحظہ ہو یہ ہیں وہ عظیم ہستیاں جنھیں اللہ تعالیٰ نے عرب و عجم کی سرداری کے لیے چھانٹا ہے۔

کبھی حضورؐ سے طنزاً کہتے کہ جس عذاب کی دھمکیاں دیتے ہو، اسے ہم پر لے کیوں نہیں آتے۔ ہم پہ آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دیجیے۔ پھر کہتے کہ یا اللہ! اگر محمدؐ کا دین برحق ہے تو پھر ہم پر آسمان سے پتھر برسا، ہمیں کوئی دردناک عذاب دے، کیوں کہ ہم اسے مان کر تو دیں گے نہیں۔ کبھی مزاحاً حضورؐ سے کہتے کہ خدا اگر قاہر و قادر ہے تو کیوں نہیں ہمیں ہدایت کے راستے پر چلا دیتا۔ کیوں نہیں وہ ہمیں بدعقیدہ ہونے سے بچاتا۔

ایسی تمام فضولیات کے جواب میں قائدِ انسانیت کو سمجھایا گیا کہ خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ [۱] یعنی ان چیزوں کو نظر انداز کیجیے، نیکی

---

[۱] الاعراف ۱۹۹۔

کی بات کیجیے اور بے تکے لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کیجیے۔ اگلا قدم وہ تھا جو اہلِ باطل اس وقت اختیار کرتے ہیں۔ جب ان پر اندھے مخالفانہ جذبات کی وجہ سے ہسٹریائی دورہ پڑنے لگتا ہے۔

آپؐ کے پڑوسیوں میں سے بعض اشراف اور سردار تک ہر شب کو آپ کے راستے میں کانٹے بچھاتے اور جھاڑیاں پھینکواتے، ابولہب کی بیوی صاحبہ تو باقاعدہ کوڑا اور غلاظت لے جاکر ڈالتی۔ نماز پڑھتے ہوئے ہمیشہ شور تو مچایا ہی جاتا تھا، ایک دن عُقبہ بن ابی مُعیط نے حالتِ نماز میں چادر آپؐ کے گلے میں ڈال کر اسے مروڑا، حضورؐ گلا گھٹنے سے گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ ایک مرتبہ گلی میں گزرتے ہوئے کسی شخص نے مٹّی سر پر ڈال دی۔ معصوم بچّی فاطمہؓ نے روتے ہوئے آپ کا سر دھویا۔ آپؐ نے فرمایا۔ "جانِ پدر! روؤ نہیں، خدا تیرے باپ کو بچائے گا" ذرا اس مقامِ یقین کا اندازہ کیجیے!

ایک مرتبہ حرم میں ابوجہل اور چند رؤسائے قریش نے ایذا رسانی کی نئی تجویز نکالی۔ عُقبہ بن ابی مُعیط ہی کو جس کا ذکر آچکا ہے، مہم سپرد کی گئی۔ وہ جاکر اونٹ کی اوجھ اٹھا لایا۔ عین حالتِ سجدہ میں غلاظت کا یہ انبار آپ کے اوپر ڈال دیا گیا۔ سردارانِ قریش خوب ٹھٹھے مار کر ہنسے۔ حضرت فاطمہؓ دوڑی دوڑی پہنچیں۔ اس بار پھر اس معصوم بچّی نے اس غلاظت کو حضورؐ کے اوپر سے ہٹایا اور کپڑے صاف کیے۔

ذرا اس ہستی کو دیکھیے جو ہر طنز و شرارت اور ہر ایذا رسانی میں نمایاں تھی۔ یہ علامت ہوتی ہے اس بات کی کہ مخالفین کا مقصد کھوٹا ہے۔ جن کا عقیدہ و مقصد اعلیٰ تھا۔ اس کی عزت اور اس کا اثر مسلسل بڑھ رہا تھا، نہ کانٹے اس کا راستہ روک سکتے تھے، نہ غلاظت اور نہ طنز و تضحیک!

ان چیزوں سے اگر فاسد نظاموں کو توڑنے والے پیغاموں کے راستے رُک سکتے تو شاید تاریخ میں کبھی کوئی انقلاب نہ آیا ہوتا۔

تقریر نمبر ۵

مخالفت و مزاحمت

دنیا کے سب سے بڑے مبارک انسان کی دعوت ایک ایک کر کے جوہرِ قابل کو سمیٹتی چلی جا رہی تھی اور مخالفت کرنے والے اہلِ مکّہ کا ہسٹریائی دورہ روز بروز تیز ہوتا جا رہا تھا۔

اس دور میں قریش کی مخالفانہ پروپیگنڈا مہم نے ظہورِ محمدیؐ کا پیغام چاروں طرف پھیلا دیا، اور لوگ خاص طور پر آپؐ کو دیکھنے اور آپؐ سے ملاقات کرنے کے لیے آنے لگے۔ آگے چلنے سے پہلے ایک دلچسپ واقعہ سُنیے :

طفیل بن عمرو دوسی ایک مردِ شریف اور شاعرِ لبیب تھا۔ وہ مکّہ آیا تو قریش کے آدمی اس سے جا کر ملے۔ کہا کہ "طفیل دیکھو تم ہمارے شہر میں آئے ہو، یہاں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سرگرمیاں ہمارے لیے ناقابلِ برداشت بنی ہوئی ہیں۔ اس کی باتیں جادوگروں جیسی ہیں، یہ بھائی بھائی اور میاں بیوی میں جدائی ڈلوا دیتا ہے۔ یعنی جو شخص اس کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اس کے خاندان والوں کی اس سے دشمنی ہو جاتی ہے۔ دیکھو کہیں تم نہ اس کے شکار ہو جانا۔ اس سے نہ بات کرنا، نہ اس کی سُننا!"

طفیل کا اپنا بیان ہے کہ اُنھوں نے مجھے اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک میں پوری طرح قائل نہ ہو گیا۔ چنانچہ حرم کی طرف جاتا تو کانوں میں روئی ٹھونس لیتا۔ ایک مرتبہ رسولِ خدا کعبہ کے پاس عبادت کے لیے کھڑے تھے تو میں بھی قریب جا کھڑا ہوا، اور آپ کی زبان سے بڑا دل پذیر کلامِ حق جی بھر کے سُنا۔ پھر دل میں سوچا کہ میں ایک صاحبِ عقل آدمی ہوں، شاعر ہوں، بُرے بھلے کی پہچان کر سکتا ہوں۔ کیوں نہ براہِ راست مل کر پوری بات سُنوں۔ اگر اچھی ہو گی تو قبول کروں گا، بُری ہو گی تو ردّ کر دُوں گا۔

جب آنحضورؐ گھر کو چلے تو طفیل ساتھ ہو لیا۔ راستے میں بتایا کہ کس طرح مجھے ان لوگوں نے پروپیگنڈا کے چکّر میں ڈال دیا تھا۔ مکان پہ پہنچ کر درخواست کی کہ اپنا پیغام ارشاد فرمایئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اسلام کی حقیقت بیان کی اور قرآن سُنایا۔ طفیل کہتا ہے کہ "خدا کی قسم! اس سے بڑھ کر اچھّا اور اس سے زیادہ سچّا کلام میں نے کبھی نہیں سُنا" چنانچہ وہ فوراً اسلام لا کر حضورؐ کی جماعت میں شامل ہوا اور واپس قبیلے میں پہنچ کر دعوت کو پھیلایا جس سے سارا قبیلہ متاثر ہو گیا۔

اسی طرح مشہور شاعر اعشیٰ بن قیس مکّہ آیا تو اسے بھی مخالفینِ اسلام نے ورغلایا۔ اس کی کمزوریاں سامنے رکھ کر کہا کہ محمدؐ تو زنا کو حرام ٹھہراتا ہے، وہ تو شراب سے بھی روکتا ہے، ایسی باتوں سے جب وہ ذرا ڈھیلا پڑا تو اسے کہا کہ بس اس سال تم لوٹ جاؤ، اگلے برس چاہو تو محمدؐ کے پیغام کو مان لینا۔ اعشیٰ واپس چلا گیا، اور سال پورا ہونے سے پہلے اس کی موت واقع ہو گئی۔

ان سے دلچسپ واقعہ مردِ اَراشی کا ہے۔ یہ مکّہ آیا، ساتھ اونٹ تھا۔ ابوجہل نے سودا کیا، مگر قیمت کی ادائیگی میں لیت و لعل کیا۔ اب یہ مختلف قریشی سرداروں سے حرم میں ملا کہ میرے پیسے دلوا دیں۔ ان میں ابوجہل سے ایسی بات کرنے کی کہاں ہمّت۔ اُنھوں نے شرارۃً حضورؐ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہ دیکھتے ہو، ایک شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلّم ہے، اس کے پاس جاؤ وہ رقم دلوا دے گا۔ اَراشی نے حضورؐ سے مل کر ماجرا بیان کیا۔ حضورؐ اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ میرے ساتھ آؤ۔ سیدھے ابوجہل کے گھر پہنچے، دستک دی، اندر

سے آواز آئی کون ہے ؟" فرمایا: "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم)، "باہر آؤ"۔
ابوجہل نکلا تو چہرے کا رنگ فق تھا۔ آپؐ نے فرمایا: اس شخص کا حق دے دو۔
چنانچہ بے چون وچرا ابوجہل نے ادائیگی کر دی۔ اراشی بھی حیران، اور سردارانِ قریش بھی!
یہ داعیٔ حق اور اس کے روشن کردار کی ہیبت تھی۔

اندازہ کیجیے کہ خدا پرستانہ انقلاب کی تحریک کس طرح اپنا راستہ بنا رہی تھی جو چٹانیں اس کے راستے میں مزاحم تھیں، عین ان کے نیچے سے تبدیلی کی بیل اپنے تار لیے کر کے نکال رہی تھی۔

قائدِ انسانیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قتل کیلئے ہاتھ اُٹھانے سے اہلِ مکّہ ڈرتے تھے کہ کہیں قبیلوں میں جنگ نہ چھڑ جائے۔ وہ حربِ فجار کے تلخ تجربے کے بعد اس سے گھبراتے تھے۔

راستہ یہ نکالا گیا کہ جناب ابوطالب پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ اسلامی انقلاب کے داعی کو اپنے دائرۂ حفاظت سے نکال دیں۔ اس قسم کی مخالفانہ اسکیموں میں بنواُمیّہ کے سرداروں کی ٹیڑھی ذہنیت بھی کام کر رہی تھی۔ کہ انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ بنوہاشم کا کوئی شخص نبی ہو۔

عُتبہ، شَیبہ، ابوسفیان بن حرب، ابوالبختری، اسود بن عبدالمطلب، ابوجہل، ولید بن المغیرہ، حجاج بن عامر کے دونوں بیٹے نُبَیہ اور مُنَبِّہ، نیز عاص بن وائل ایک وفد بنا کر جناب ابوطالب کے پاس پہنچے۔ اپنا معاملہ یوں پیش کیا:

ابوطالب! تمھارا بھتیجا ہمارے خداؤں اور ٹھاکروں کو بُرا بھلا کہتا ہے، ہمارے مذہب میں عیب چھانٹتا ہے، ہمارے بزرگوں کے طریقے کو غلط اور خود ان کو احمق قرار دیتا ہے، ہماری عقیدتوں کو مجروح کرتا ہے اور اسلاف کی توہین کرتا ہے۔ اب یا تو تم اُس کو ان زیادتیوں سے روکو، یا ہمارے اور اُس کے درمیان سے نکل جاؤ۔

جناب ابوطالب نے ساری گفتگو تحمل سے سنی، نرمی سے سرداروں کو سمجھا بجھا کر بات ٹال دی۔ وفد واپس آ گیا۔ محمدؐ اپنی دعوت میں بدستور سرگرم رہے اور قریش حسبِ سابق

پیچ و تاب کھاتے رہے۔

کچھ دنوں بعد پھر ایک وفد پہنچا اور اس نے قصہ چھیڑا کہ:

"ہم نے مطالبہ کیا تھا کہ ہمیں اپنے بھتیجے سے بچاؤ، لیکن تم نے کچھ نہیں کیا۔ ہم اپنے مذہب اور اپنے بتوں اور اپنے بزرگوں کے خلاف تمہارے بھتیجے کی باتیں برداشت نہیں کر سکتے۔ اسے باز رکھو، ورنہ ہم اس سے بھی اور تم سے بھی لڑیں گے۔"

جناب ابو طالب نے دیکھا کہ بات بڑھتی جا رہی ہے، سو اپنے محبوب بھتیجے کو بلا کر کہا "بھتیجے مجھ پر اتنا بڑا بوجھ نہ ڈالو جس کا اٹھانا میرے بس سے باہر ہو۔" حضورؐ نے محسوس کیا کہ جس پتھر پر پاؤں جمار کھے تھے وہ اب سرکنے والا ہے۔ اس نازک مرحلے پر اپنے منصب جلیل کی بلندیوں سے فرمایا:

"چچا جان! خدا کی قسم! یہ لوگ اگر میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ کر چاہیں کہ اس مشن کو چھوڑ دوں تو بھی میں اس سے باز نہیں آسکتا۔ یہاں تک کہ یا تو اللہ تعالیٰ اس مشن کو غالب کر دے یا میں اسی جدوجہد میں ختم ہو جاؤں۔"

حضورؐ کے اندر سے وہ قوت بول رہی تھی جو تاریخ کو الٹ پلٹ دیتی ہے۔ ابو طالب کا دل بھی پسیج گیا۔ انھوں نے کہا کہ "بھتیجے جاؤ، جو کچھ تمھیں پسند ہے اس کی دعوت دو، میں کسی وجہ سے تم کو نہیں چھوڑوں گا۔"

بات تو ذرا بعد کی ہے مگر متذکرہ کوشش ہی کی ایک کڑی ہے کہ حضرت حمزہؓ و عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد ایک مرتبہ اور وفد سرداران قریش جناب ابو طالب کے پاس آیا۔ اس کی اسکیم تھی کہ معاہدہ ہو جائے۔ وفد نے کہا کہ جو کچھ صورت حالات ہے وہ آپ کے سامنے ہے، اپنے بھتیجے کو بلوایئے، اس کے بارے میں ہم سے، اور ہمارے بارے میں اس سے عہد لیجیے کہ وہ ہم سے باز رہے، ہم اس سے باز رہیں۔ وہ ہمارے مذہب سے واسطہ نہ رکھے، ہم اس کے مذہب سے واسطہ نہیں رکھیں گے۔ رسول پاکؐ کو اس بار

پھر مجلس میں بلوا کر سارا قصہ بتایا گیا۔ قریش کی بات تو مذہب کی بات تھی، لیکن قائدِ انسانیت تو پوری انسانیت کو مذہب سے وسیع تر نظامِ حیات کا پیغام دے رہا تھا جسے دوسرے لفظوں میں دین کہا جاتا ہے۔ پس حضورؐ نے وفد کو جواب یہ دیا کہ:

"میرا ایک کلمہ ہے، اگر اسے مان کے دو تو سارا عرب تمہارے زیرِ نگیں ہوگا اور سارا عجم تمہارے پیچھے چلے گا۔"

ذرا اس وقت کے اذیت ناک اور مایوس کن ماحول اور اہلِ ایمان کی قلیل تعداد اور مکّہ والوں کے شدید عناد کو سامنے لایئے اور پھر سوچیے کہ یہ صرف خدا کے نبی ہی کا مقام ہے کہ ایسے میں وہ اپنی دعوت کے مستقبل کو دُور تک دیکھ کر بات کرے۔ حضورؐ تو گویا تاریکیوں کے ہجوم میں کہہ رہے تھے کہ صُبح ہونے والی ہے اور سُورج نکلنے والا ہے۔

حج کا موسم ایک بڑا مسئلہ تھا۔ باہر سے جب لوگ آتے تو حضورؐ دین کا پیغام ان تک ضرور پہنچاتے۔ ایسا ہی موقع آنے والا تھا کہ ولید بن مُغیرہ کے گھر پر اکابرِ قریش کی میٹنگ ہوئی۔ ولید نے کہا کہ حج کا موسم قریب ہے، عرب کے وفود آئیں گے، وہ تمہارے اس آدمی (یعنی محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم) کا قصہ سُن چکے ہیں، اس لیے ان کا ذوقِ تجسس ہوگا اور یہ شخص جا جا کر ان سے ملے گا۔ یہ بہت بڑے خطرے کا موقع ہے، پہلے سے کوئی تدبیر کر لو۔

پھر بحث ہوتی رہی کہ اسے "کاہن" کہہ کر آنے والوں کو چونکا دیا جائے، یا اسے آسیب زدہ قرار دیا جائے، یا شاعر شمار کیا جائے، یا یہ کہ وہ جادُوگر ہے۔ بحث میں ہر الزام کے سامنے آنے پر سرداروں نے خود ہی اس کے بے بنیاد ہونے کا ذکر کیا۔ جب کوئی بات طے نہ ہو سکی تو پھر سب نے ولید ہی کی طرف روئے سخن کیا کہ کچھ تم ہی کہو اے ابو عبد الشمس؟

اور ابو عبد الشمس نے خوب باتیں کہیں، یہ تک کہہ ڈالا کہ "یہ پیغام غالب ہوگا، اسے مغلوب نہیں کیا جا سکے گا اور یہ سب کو کُچل ڈالے گا۔" تمہاری ساری باتیں لایعنی ہیں۔ کام چلانے کے لیے جادُوگری کا الزام کام دے سکتا ہے۔ لوگوں کو بتایا جائے کہ اس کی بات پھیلنے سے باپ بیٹے، میاں بیوی اور بھائی بھائی میں جدائی پڑ رہی ہے۔"

دیکھا آپ نے، ایک شخص کا دل مان رہا ہے کہ محمدؐ کا پیغام عظیم ہے اور غالب

ہو گا، مگر پھر بھی مخالفت کرنے کا فیصلہ ہوتا ہے، اور وہ بھی اس طرح کہ مختلف من گھڑت الزاموں کو جانچا جاتا ہے کہ کس سے کام چل سکتا ہے۔ ایسے ہوتے ہیں اہلِ باطل!

رَبِیعہ بن عُبادہ جو بعد میں اسلام لائے، اُس موسمِ حج میں دس سالہ بچے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ایک ایک قبیلے کے لوگوں میں جا کر کہتے کہ میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں اور تم سے کہتا ہوں کہ اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، بُتوں سے کنارہ کشی کرو، میری تصدیق کرو اور میرا ساتھ دو۔ یہاں تک کہ میں اللہ کی طرف سے ساری بات کھول کے رکھ دوں۔ پھر ربیعہ کہتے ہیں کہ ایک شخص عَدَنی حُلہ اوڑھے حضورؐ کے ساتھ ساتھ لگا تھا اور جب رسولؐ پاک اپنی بات کہہ چکتے تو وہ پکار کر کہتا کہ اے بنی فلاں! یہ شخص تم کو لات وعُزّیٰ سے ہٹا کر بدعت و گمراہی کی طرف کھینچ رہا ہے۔ اس کی بات ہرگز نہ سنو۔ یہ شخص تھا ابولہب!

اسی طرح بازارِ ذوالمجاز میں ایک بار آپ اپنی دعوت دے رہے تھے اور ابوجہل مٹی اُٹھا اُٹھا کر آپؐ پر پھینکتا اور لوگوں سے کہتا کہ اس کے قریب نہ آنا۔

پھر اِن مخالفینِ حق نے جب دیکھا کہ وہ عزمِ نبوت کی چٹان کو مخالفت سے ہلا نہیں سکتے تو اُنھوں نے سودا بازی کی راہ اختیار کی۔ بڑی ملائمت سے آپؐ سے عرض کیا کہ دیکھو محمدؐ! ہم بھی تمھارے قریب ہو سکتے ہیں، بس تم اتنا کرو کہ ہمارے اصنام و آلہہ کے خلاف کچھ نہ کہو، ہو سکے تو اپنے قرآن میں تھوڑی سی ترمیم کر لو، یا چاہو تو بالکل ہی ایک نیا قرآن لے آؤ جس میں کچھ ہمارا بھی خیال رکھا گیا ہو۔ آپؐ نے جواب دیا کہ یہ میرے اختیار میں نہیں۔ اس سے بڑا ظالم کون ہو گا جو کوئی بات اپنے پاس سے گھڑ کر اللہ تعالیٰ سے منسوب کر دے۔

مُخالف سرداروں نے ایک مطالبہ یہ اُٹھایا کہ محمدؐ! تم اگر اپنے حلقے سے گھٹیا لوگوں، کمیروں اور کملوں اور غلاموں اور لونڈوں کو نکال دو تو پھر ہم بھی تمھارے پاس آ کے بیٹھیں گے اور کلام سُنیں گے۔ تمھارے ان ادنیٰ ساتھیوں میں بھلا ہم اکابر کیسے بیٹھ سکتے ہیں! اس سے آپ نے انکار کر دیا کہ یہ لوگ جو ہر قسم کے مفاد کے بندھنوں سے آزاد ہونے کی وجہ سے آگے آئے ہیں اور میرا ساتھ دے کر تکلیفیں اُٹھا رہے ہیں اور قربانیاں

کر رہے ہیں، میں ان کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔

ایک اور زبردست وار کیا گیا۔ حرم میں قریش کی ایک مجلس اعلیٰ نے عُتبہ بن ربیعہ کو اپنا نمائندہ بنا کر حضورؐ کے پاس بھیجا کہ ہماری طرف سے اس شخص کے سامنے یہ پیش کش کرو کہ اگر مقصود دولت ہو تو ہم چندہ کر کے مال کا ڈھیر لگا دیتے ہیں، اگر سرداری اور قیادت چاہتے ہو تو ہم تمھیں سردار بنا دیتے ہیں، اگر بادشاہت چاہتے ہو تو اس کے لیے تیار ہیں، اگر کسی جنّ کا سایہ ہے یا جادُو کا اثر تو ہم ہر ممکن علاج کراتے ہیں۔ معلوم کر کے آؤ کہ محمدؐ اصل میں کیا چاہتا ہے۔ یعنی یہ ساری پیش کش حضورؐ کے خلوص کی نفی پر مبنی تھی۔ پھر حضورؐ نے عُتبہ سے کہا کہ تم نے اپنی بات کہہ لی، اب میری بات سُنو۔ یہ کہہ کر آپ نے سورۂ حٰمٓ کی چند آیات تلاوت کیں، جن کا ترجمہ یہ ہے:

یہ حٰمٓ ہے۔ یہ بڑی مہربان اور رحم والی ہستی کی طرف سے بھیجی گئی ہے۔ یہ ایک نوشتہ ہے جس کی ایک ایک آیت نکھری ہوئی ہے۔ یہ قرآن ہے، عربی زبان میں، سمجھ بوجھ سے کام لینے والوں کے لیے! قرآن (ایمان لانے والوں کو) بشارت سنانے والا، (اور انکار کرنے والوں کو) تنبیہ کرنے والا۔ پس اُن (یعنی اہلِ مکّہ) میں سے اکثریت نے اس سے روگردانی کی اور سن کر ہنس دیتے ہیں اور وہ کہتے ہیں ہمارے دل اس حقیقت کے مخالف ہیں جس کی طرف تم بلاتے ہو اور ہمارے کانوں میں گرانی ہے اور ہمارے اور تمھارے درمیان ایک پردہ حائل ہو گیا ہے۔ تم اپنا کام کرو ہم اپنا کام کیے جائیں گے۔ عتبہ اٹھا اور ساتھیوں میں جا کر اس نے کہا:

"ماجرا یہ ہے کہ میں نے ایسا کلام سُنا ہے جیسا کبھی نہیں سُنا۔ بخدا نہ وہ شعر ہے، نہ جادُو ہے اور نہ کہانت ہے۔ خدا کی قسم اس سے کوئی بڑا نتیجہ نکلنے والا ہے۔ اے گروہ قریش! میری بات مانو، اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اہلِ عرب نے اس سے نمٹ لیا تو تمھیں نجات ہو جائے گی اور اگر وہ عرب پر چھا گیا تو اس کی سلطنت تمھاری سلطنت ہو گی اس کے ذریعے تم تمام لوگوں میں خوش نصیب ہو جاؤ گے۔" (تلخیص کردہ)

اندازہ کیجیے، کس قدر صحیح سمجھا عُتبہ۔ اس نے یہ بھی اندازہ کر لیا کہ نری مذہب داری کا معاملہ نہیں ہے کہ اس سے سلطنت نمودار ہونے والی ہے۔ اس نے بہت بڑے انقلاب کو اس کلام کے پردوں کے پیچھے دیکھ لیا۔

وہی پیش کش شام کو سرداروں نے خود حضورؐ کے سامنے رکھی۔ ذرا جواب سُنیے۔

"تم لوگ جو کچھ کہہ رہے ہو، میرا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ دعوت سے میرا مطلوب مال و دولت یا سرداری اور بادشاہت حاصل کرنا نہیں، مجھے تو خدا نے تمہاری طرف اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ . . . سو میں نے خدا کی ہدایات تم تک پہنچا دی ہیں۔ اگر میری دعوت کو تم قبول کر لو تو یہ تمہارے لیے دنیا و آخرت کی بھلائی کا ذریعہ ہے، اور اگر تم اسے میری طرف واپس پھینک دو تو میں صبر سے اللہ کے حکم کا انتظار کروں گا۔"

اس جواب پر غور کرنے کے بجائے مخالفین نے اور ہی قصے چھیڑ دیے۔ مثلاً کہا کہ تم جانتے ہو کہ ہماری زمین تنگ ہے اور پانی کی کمی ہے۔ تم خدا سے کہو کہ یہاں سے پہاڑوں کو ہٹا دے اور شام و عراق کی طرح دریا بہا دے۔ پھر یہ کہ خدا سے کہو کہ وہ ہمارے آباؤ اجداد کو اُٹھا کھڑا کرے جن میں قصّی بن کلاب بھی ہو تاکہ ہم اس دانا آدمی سے تمہارے متعلق پوچھ سکیں۔ نہیں تو پھر ہم پر عذاب ہی وارد کر دو۔ حضورؐ کا ایک ہی جواب تھا، مَا بِهٰذَا بُعِثْتُ۔ مجھے اس کام کے لیے مامور نہیں کیا گیا۔

تقریر نمبر ۶

حق کے دیوانوں پہ کیا گزری

مخالفینِ حق نیتوں کے لحاظ سے کھوٹے اور دلائل کے لحاظ سے کھوکھلے ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے اصل مسئلہ اپنے اقتدار اور مفاد کا ہوتا ہے۔ تبدیلی کی کوئی دعوت اگر اٹھے اور وہ ٹھوس دعوت ہو اور اس کے علمبردار ایمانی، عقلی اور اخلاقی لحاظ سے مضبوط ہوں تو پھر مخالفین بہت جلد چھوٹے ہتھیاروں پر آجاتے ہیں اور بات مقطع میں آپڑتی ہے۔

مکہ میں دعوتِ محمدیؐ کے ظہور کے ساتھ ہی ذہنی اذیت دینے کا بھی سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور جسمانی طور پر تنگ کرنے کا بھی، مگر باقاعدہ تشدد و بہیمیت کی لہر ذرا آگے چل کر اٹھی اور تیزی سے بلند ہوتی چلی گئی۔ آیئے دورِ تشدد کے چند مناظر دیکھیے۔

خبابؓ بن الارتؓ تمیمی کو ام نمار نے دورِ جاہلیت میں بطور ایک غلام کے خریدا۔ یہ جب ایمان لائے تو دشمنانِ حق نے دہکتے انگارے بچھا کر ان کو بسترِ آتشین پر لٹایا اور چھاتی پر ایک شخص کھڑا ہو گیا تاکہ کروٹ نہ لے سکیں۔ انگارے پیٹھ کے نیچے ہی ٹھنڈے ہو گئے اور گوشت جگہ جگہ سے جل گیا۔ بعد میں حضرت عمرؓ کو ایک مرتبہ انھوں

نے پُشت سے قمیض اُٹھا کر نشانات دکھلائے۔ برص کی طرح کے سفید داغ ساری پُشت پر تھے۔ یہ آہن گر تھے اور ان کی جو رقمیں اہلِ قریش کے ذمّے تھیں، وہ انھوں نے داب لیں اور کہا کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کا انکار نہیں کرو گے ایک کوڑی بھی نہیں ملے گی۔ حق کا یہ جانباز جواب میں یہ کہتا ہے کہ تم لوگ جب تک مر کر زندہ نہ ہو جاؤ، ایسا نہیں ہو سکتا۔

حضرت بلال رضؓ حبشی اُمیّہ بن خلف کے غلام تھے، یہ بھی ایمان لائے۔ جب سورج ٹھیک نصف النہار پر آجاتا تو عرب کی تپتی ریت پر ان کو لٹا کر سینے پر بھاری پتھر رکھ دیا جاتا۔ اس حالت میں امیّہ ان سے کہتا کہ اسلام سے باز آؤ ورنہ ختم ہو جاؤ گے۔ حضرت بلال رضؓ بس "اَحَد، اَحَد" پکارتے۔ امیّہ غصّے سے بپھر جاتا اور آپ کے گلے میں رسی ڈال کر شہر کے لونڈوں کے سپرد کر دیتا کہ گلی گلی گھسیٹتے پھریں۔ کبھی آپ کو گائے کی کھال میں لپیٹا جاتا، کبھی آہنی زرہ پہنا کر تیز دھوپ میں بٹھایا جاتا۔ وہ بدستور "اَحَد اَحَد" پکارتے رہتے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا۔

بڑا قصہ تو یاسر اور آلِ یاسر کا ہے۔

یاسر قحطانی الاصل تھے۔ کسی سلسلے میں وہ مکّہ میں آئے اور ابوحُذیفہ مخزومی سے حلیفانہ تعلق قائم کر کے یہیں رہ پڑے اور شادی کر لی۔ یاسر رضؓ سمیت سارا گھرانا اسلام لے آیا، خصوصاً حضرت عمّار بن یاسر پر سخت ستم ڈھائے جاتے۔ ان کو جلتی زمین پر لٹایا جاتا، قریش ان کو اتنا مارتے کہ بار بار بے ہوش ہو جاتے۔ ان کے والدین کو بھی شدید اذیتیں دی گئیں۔ کبھی پانی میں غوطے دیے جاتے، کبھی انگاروں پر تڑپایا گیا۔ سمیّہ رضؓ جو حضرت عمّار رضؓ کی والدہ تھیں ان کو اسلام لانے پر ابوجہل نے وحشیانہ طور پر برچھی مار کر ہلاک کر دیا۔ عمّار رضؓ کے والد یاسر رضؓ بھی ظلم سہتے سہتے شہید ہو گئے۔ حضور صلعم کا گزر ہوتا تو فرماتے "سلام علی آلِ یاسر" نیز ان کو خوشخبری دیتے: "اِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃ" تمھارے لیے جنّت کی بشارت ہے۔ عمّار رضؓ کے بارے میں فرماتے کہ وہ سر سے پیر تک ایمان سے بھرا ہوا ہے۔

حضرت صُہیب رضؓ کو اس بے دردی سے مارا جاتا کہ حواس باختہ ہو جاتے۔ ابوفُکیہہ کو

پاؤں میں رسّی ڈال گرم ریت پر گھسیٹا جاتا۔ اُمیّہ نے ایک بار زور سے گلا گھونٹا تو ایسے لگا کہ جان نکل گئی مگر بچ رہے۔ ایک مرتبہ بھاری پتّھر سینہ پر رکھا گیا تو کرب کے مارے ان کی زبان باہر نکل آئی۔ کبھی ان کو لوہے کی زرہ پہنا کر جلتی زمین پر لٹایا جاتا۔ ان کو حضرت صدیقؓ نے خرید کر آزاد کر دیا۔ لُبَینَہ نامی کنیز کو تو حضرت عمرؓ اتنا مارتے کہ تھک ہار کر ہاتھ روکتے۔ دَم لے کر پھر مارنے لگتے۔

زنیرہؓ حضرت عمرؓ کے گھرانے کی کنیز تھیں، اس لیے حضرت عمرؓ اسے پوری بے دردی سے مارتے۔ ایک مرتبہ ابوجہل نے بے رحمانہ طریق سے مارا تو ان کی آنکھیں ضائع ہو گئیں۔ ان کو بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خرید کر آزاد کر دیا۔ نَہدِیہ اور ام عُبَیس بھی کنیزیں تھیں، ان پر بھی شدید مظالم کیے گئے۔

ذرا غور فرمایئے کہ قریش کے بڑے بڑے ذی مرتبہ سردار لونڈیوں اور غلاموں پر اپنی قوّت بازو کو آزما کر دینِ حق کے خلاف اپنا غصہ ٹھنڈا کرتے۔ وہ ٹھنڈا تو کیا ہوتا اور بھڑک جاتا۔ کتنی پست روش تھی۔ ہر وہ نظریہ اور مذہب جس سے پست روش پیدا ہو، وہ اپنی پستی کا اعلان کرتا ہے۔

اب کچھ آزادوں کا حال بھی سُنیے۔

حضرت عثمانؓ جو عمر کے لحاظ سے قابلِ احترام تھے اور مال وجاہ بھی رکھتے تھے، اُنھوں نے حضورؐ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تو ان کے اپنے چچا نے رسّی سے باندھ کر پیٹا۔

حضرت ابوذر نے محمّدی کلمۂ انقلاب کو قبول کیا تو جوش میں آ کر سیدھے کعبہ پہنچے اور بآوازِ بلند کلمہ پڑھا۔ قریش چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے، مارتے مارتے آپ کو زمین پر گرا دیا۔ حضرت عباسؓ کا اتفاقاً گزر ہوا۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو قبیلۂ غِفار کا آدمی ہے اور تمھیں تجارت کے لیے اسی قبیلے کے علاقے سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ سن کر لوگ باز آ گئے۔ دوسرے دن پھر ایسا ہی ہوا۔

حضرت زُبیر بن العوّام کو بیداریٔ ضمیر کی سزا یہ دی گئی کہ ان کے چچا چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھواں دیتے، مگر حضرت زبیر پکار کے کہتے کہ میں اب کفر تو ہرگز نہیں کروں گا۔

سعد بن زید (حضرت عمرؓ کے چچا زاد بھائی) کو حضرت عمرؓ نے رسیوں سے باندھ دیا۔ سعد بن وقاص پر بھی تشدد کیا گیا۔ عبداللہ بن مسعود نے دینِ اسلام کی انقلابی تحریک کا پیغام قبول کیا تو زورِ ایمان میں حرم پہنچ کر پہلی مرتبہ باآوازِ بلند قرآن پڑھا۔ سورہ رحمٰن کی تلاوت شروع کی ہی تھی کہ مشرکانہ جمود کے محافظ ٹوٹ پڑے اور منہ پر طمانچے مارے، انھوں نے تلاوت اس حال میں بھی جاری رکھی۔ واپس ہوئے تو چہرہ لہو لہان تھا۔

عثمان بن مظعون حرم میں قریش کی مجلس میں بیٹھے تھے کہ لبید نے ایک مصرع پڑھا۔ دوسرا پڑھا تو عثمان بن مظعون نے کہا کہ یہ بات تم نے غلط کہی۔ لبید کا خون کھول گیا کہ یہ جسارت۔ اور حق گوئی کی جسارت بڑے بڑوں کے سامنے کہنے کا عزم دین اسلام کی تحریکِ فلاحِ انسانیت نے سب میں پیدا کر دیا تھا۔ کسی نے کہا کہ یہ شخص احمق ہے جس نے ہمارے آبائی دین دھرم سے بغاوت کر لی ہے۔ عثمانؓ بھی کہاں چپ رہنے والے تھے۔ ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اس پہ بات کرنے والا شخص اُٹھا اور اس نے عثمان بن مظعون کے چہرے پر ایسا تھپڑ مارا کہ ان کی آنکھ پھوٹ گئی۔ حضرت عثمانؓ نے جرأت سے کہا کہ میری جو آنکھ بچ رہی ہے وہ بھی قربان ہونے کو تیار ہے۔

حضرت اُمِ شریکؓ ایمان لائیں تو ان کے اعزہ و اقارب نے انھیں چلچلاتی دھوپ میں کھڑا کر دیا۔ اس حالت میں وہ ان کو شہد جیسی گرم غذا دیتے اور پانی نہ پلاتے۔ تین دن مسلسل اسی عالم میں گزر گئے۔ ان سے ترکِ اسلام کا مطالبہ کیا گیا۔ وہ حواس میں نہ تھیں، کچھ نہ سمجھیں۔ پھر آسمان کی طرف اشارہ کر کے مدعا بتایا گیا۔ جب سمجھ گئیں تو کہا کہ خدا کی قسم میں تو اپنے عقیدے پر قائم ہوں۔ حد یہ کہ حضرت ابو بکر اور طلحہ، ولید بن ولید، عیاش بن ابی ربیعہ اور سلمہ بن ہشام کو اذیتیں دی گئیں۔ خالد بن عاص نے جب اسلام قبول کر کے قائدِ انسانیت کو اپنا قائد مانا تو ان کے باپ نے اس قدر مارا کہ سر زخمی ہو گیا۔ اُن کو فاقہ کا عذاب بھی دیا گیا۔ پورا مکہ ایک گرم بھٹی بن گیا جس میں ہر مسلم کو تپایا جا رہا تھا۔ گلی گلی اور گھر گھر عقوبت خانے کھلے تھے۔

لیکن بے مثال ہے یہ صورت واقعہ کہ درد و کرب کی کڑی منزلوں سے گزرنے

والوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو پیچھے پلٹا ہو یا جس کے ضمیر نے شکست قبول کی ہو۔ مردوں کی طرح عورتیں اور آزادوں کی طرح لونڈیاں اور غلام ایک ایسے ایمان کا مظاہرہ کر رہے تھے کہ جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ خدا کو خدا ماننے اور رسول کو رسول اور قائد اور پیشوا تسلیم کرنے کا یہ ہے نمونہ و معیار۔ مار کھانے والوں کے سینوں میں جو انقلابی رَو دوڑ رہی تھی وہ اور بھی زور دار ہو گئی، ان کے صبر نے اہلِ استبداد کو عاجز کر دیا۔ ظالم شکست کھا گئے کیونکہ وہ کسی ایک فرد کو بھی اس کے مقام سے ہٹا نہ سکے۔

حضورؐ جہاں فلاحِ انسانیت کی مہم کے سپاہیوں کی عزیمت و استقامت دیکھ کر اطمینان حاصل کرتے، وہاں آپ کو یہ بھی احساس تھا کہ آخر انسانی قوت برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ظلم و استبداد کا ریلا کہیں تھمنے میں نہیں آ رہا تھا بلکہ روز بروز زور پکڑ رہا تھا۔ حضورؐ اپنے رفقا کا حال دیکھ دیکھ کر کڑھتے مگر کوئی زور نہ چلتا تھا۔ سہارا صرف خدا کا تھا، قوت ایمانی کا تھا، دُعا و ذکر کا تھا، سچائی کی فتح کی قوی امیدوں کا تھا۔ حضورؐ رفقا کو تسلّی دلاتے کہ خدا کوئی راستہ نکالے گا۔ آثار بتا رہے تھے کہ تحریکِ اسلامی کا شجرۂ طیبہ مکّہ کی سنگلاخ زمین میں برگ و بار نہ لا سکے گا۔ یہ سعادت کسی اور گوشۂ زمین کے لیے مقدر ہے۔ نیز چونکہ دینِ اسلام کی تحریکِ فلاحِ انسانیت کی سابق تاریخ بتاتی تھی کہ یہاں ایک مرحلہ ہجرت کا بھی ضرور آیا کرتا ہے، لہٰذا حضورؐ کے دل میں یہ خیال موجود تھا کہ آپ کو اور آپ کے رفیقوں کو وطن چھوڑنا ہو گا۔ حضورؐ نے ستم رسیدہ و الم چشیدہ رفقا کو مشورہ دیا کہ زمین میں کسی اور طرف نکل جاؤ، خدا جلد ہی سب کو یکجا کرے گا۔ پوچھا گیا کہ کدھر جائیں؟ حضورؐ نے فرمایا کہ حبشہ چلے جاؤ۔ یہ اس لیے کہ حبشہ میں عیسائیت کی بنیاد پہ ایک عادلانہ حکومت قائم تھی۔ اس ملک کے چرچے تو پہلے سے سُنے جاتے ہوں گے۔ اسی لیے حضورؐ نے اس کے متعلق فرمایا کہ ھِیَ اَرضُ صدقٍ ۔ وہ راستی کی سرزمین ہے۔ بعد میں حضورؐ کی رائے اور الفاظ سچ ثابت ہوئے۔

نبوت کے ۵ ویں سال حضورؐ کی انقلابی جماعت کے گیارہ مردوں اور چار عورتوں کا قافلہ حضرت عثمان بن عفّانؓ کی زیرِ قیادت رات کی تاریکی میں حبشہ کو روانہ ہوا۔ حضرت

عثمان کے ساتھ ان کی اہلیہ محترمہ، یعنی رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی جناب رقیہؓ بھی اولیں سفرِ ہجرت پہ نکلیں۔ حضورؐ نے اس مبارک جوڑے کے بارے میں فرمایا کہ حضرت لوط اور ابراہیم علیہما السلام کے بعد یہ پہلا جوڑا ہے جس نے خدا کی راہ میں وطن چھوڑا۔

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ جس طرح اسلام لانے میں پہل کرنے والی ایک خاتون تھیں، جس طرح اذیتیں برداشت کرنے میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی اپنا حصّہ پا رہی تھیں اور استقامت میں اُنھوں نے اپنے مساویانہ مرتبہ کا ثبوت دے دیا۔ اسی طرح اب عورتیں ہجرتِ حبشہ کے لیے دوسرے ملک کو جانے والے قافلے میں بھی شریک تھیں۔

اس قافلۂ مہاجرین کے نکلنے کے بعد جب قریش کو خبر ہوئی تو تعاقب میں آدمی دوڑے۔ لیکن تعاقب کرنے والے جب بندرگاہ جدہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ جانے والے جا چکے۔ اُنھیں فوراً ہی کشتیاں تیار مل گئیں۔ اگر خدا کی طرف سے ایسا نہ ہوتا تو نجانے کیا ہوتا۔ ان مہاجرین نے تھوڑا ہی عرصہ (رجب سے شوال تک) حبشہ میں گزارا تھا کہ یہ افواہ پہنچی کہ قریش نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ سب لوگ پلٹ آئے۔ مگر مکّہ کے قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ افواہ غلط تھی۔ مجبوراً ان میں کچھ چھپتے چھپاتے مکّہ پہنچے اور کچھ نے کسی کی حمایت حاصل کر لی۔ نتیجہ یہ کہ پہلے سے بڑھ کر استبداد ہونے لگا۔

مسلمانوں کی واپسی کے بعد تشدّد کا زور اور بڑھ گیا پس دوبارہ زیادہ بڑا قافلۂ مہاجرین نکلا جس میں ۸۵ مرد اور ۱۷ عورتیں شامل تھیں۔ یہ تمام نفوس حبشہ پہنچے۔ وہاں ان کو پُرامن فضا ملی اور اسلام کے نقشے پہ زندگی بسر کرنے لگے۔

اِدھر مکّہ میں دشمنانِ اسلام نے اس معاملے پہ بحث و تمحیص کر کے ایک منصوبہ بنایا۔ عبداللہ بن رُبیعہ اور عمرو بن العاص کو سفارت کے لیے مامور کیا کہ یہ شاہ حبشہ سے جا کر بات کریں اور مہاجرین کو واپس لائیں۔ نجاشی اور اس کے درباریوں اور پادریوں کے لیے گراں بہا تحائف تیار کیے گئے۔ بڑے سرو سامان کے ساتھ سفارت روانہ ہوئی۔ اہلِ سفارت نے حبشہ پہنچ کر پہلے تو پادریوں اور درباریوں سے ملاقاتیں کیں اور ان کو رشوتیں دیں اور مہاجرین کے بارے میں اُنھیں چکر میں ڈالا کہ اُنھوں نے ایک مذہبی فتنہ ہمارے شہر میں کھڑا

کیا ہے جو عیسائیت کے لیے بھی اتنا ہی خطرناک ہے جتنا ہمارے مذہب کے لیے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ شاہِ نجاشی اُن کی بات یک طرفہ طور پر سُنے اور مہاجرین کو بولنے کا موقع دیے بغیر اُنھیں ہمارے حوالے کر دے۔ فضا تیار کر کے سفارت دربار میں پہنچی۔ پھر اپنی غرض بیان کی کہ مکّہ کے اشراف نے ہمیں بھیجا ہے کہ آپ ہمارے آدمیوں کو ہمارے ساتھ واپس کر دیں۔ درباریوں اور پادریوں نے تائید کی۔ نجاشی نے دوطرفہ بات سُنے بغیر کارروائی کرنے سے انکار کر دیا۔

دوسرے دن دونوں فریق دربار میں طلب کیے گئے۔ مسلمانوں کو جب حکم ملا تو اُنھوں نے اپنے اور عیسائی بادشاہ کے اختلافِ مسلک کو سامنے رکھ کر مشورہ کیا۔ طے پایا کہ ہم دربار میں وہی کچھ کہیں گے جو کچھ خدا کے نبیؐ نے ہم کو سکھایا ہے۔ پھر جو ہو سو ہو۔ یہ ہوتی ہے اہلِ ایمان کی روش! دربار میں پہنچے تو مقررہ آداب کے مطابق شاہ کو سجدہ نہیں کیا۔ درباریوں نے بُرا منایا اور سوال کیا کہ سجدہ کرنے سے اجتناب کیوں؟ حضرت جعفرؓ مسلم وفد کے متکلم تھے۔ اُنھوں نے پوری جرأت سے جواب دیا کہ ہم لوگ سوائے اللہ کے کسی کو حتیٰ کہ اللہ کے رسولؐ کو بھی سجدہ نہیں کرتے۔ رشوت چاپلوسی اور خوشامد سے کام لینے والوں کے مقابل میں یہ اصول پسندانہ روش کتنی ممتاز معلوم ہوتی ہے۔

اب سفارتِ مکّہ نے اپنا دعویٰ پیش کیا کہ یہ مہاجرین ہمارے بھگوڑے مجرم ہیں اِنھوں نے نیا دین گھڑ لیا ہے اور ایک تخریبی طوفان کھڑا کر دیا ہے۔ لہٰذا ان کو ہمارے حوالے کیا جائے۔

حضرت جعفرؓ اُٹھے اور اجازت طلب کی کہ پہلے وہ سفارتِ مکّہ سے کچھ سوال کر لیں۔ اجازت مل گئی۔ اُنھوں نے ایک ایک کر کے یہ چند سوال پوچھے اور سب کا جواب سفارتِ مکّہ کو نفی میں دینا پڑا۔ پوچھا کہ کیا ہم کسی کے غلام ہیں جو آقا سے بھاگ آئے ہیں؟ کیا ہم کسی کو ناحق قتل کر آئے ہیں؟ کیا ہم کسی کا کچھ مال لے کر بھاگے ہیں؟ ان میں سے کوئی بھی بات صحیح ہے تو ہمیں واپس کیا جانا چاہیے۔ جب پوزیشن پوری طرح صاف ہو گئی تو اب حضرت جعفرؓ نے شاہ اور درباریوں کے سامنے ذیل کی تقریر کی:

"اے بادشاہ ہم ایک جاہل قوم تھے، بُت پوجتے تھے، مردار کھاتے

تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، قوی لوگ کمزوروں کو کھا جایا کرتے تھے۔ اس اثنا میں ہمارے درمیان ایک شخص پیدا ہوا جس کی شرافت، سچائی اور دیانت سے ہم لوگ پہلے سے آگاہ تھے۔ اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھلایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خون ریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں۔ عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں۔ نماز پڑھیں، روزے رکھیں، صدقہ دیں۔ پس ہم نے شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمال بد سے باز آئے۔ یہ ہے ہمارا جرم جس کی وجہ سے ہماری قوم ہماری دشمن بن گئی اور ہم کو مجبور کرتی ہے کہ پھر اسی گمراہی کی طرف لوٹ جائیں۔ پس ہم اپنا ایمان اور اپنی جانیں لے کر آپ کی طرف ہجرت کر آئے ہیں۔ یہ ہے ہماری روداد۔"

بات سچی ہو اور کہنے والا دلی جذبات سے کہے تو لازماً وہ اثر کرتی ہے۔ نجاشی کا دل نرم ہوگیا۔ اس نے قرآن سننے کی فرمائش کی۔ حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کا ایک حصہ پڑھا۔ آیاتِ الٰہی کو سن کر نجاشی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ پکار اٹھا "خدا کی قسم، یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں۔" بلکہ مزید کہا کہ "محمدﷺ تو وہی رسول ہیں جس کی خبر یسوع مسیح نے دی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اس رسولﷺ کا زمانہ ملا۔" ساتھ ہی فیصلہ سنا دیا کہ مہاجرین کو واپس نہیں کیا جا سکتا۔

ناکامی کی چوٹ کھا کر مکہ کے سفیروں نے درباریوں اور پادریوں سے مشورہ کر کے طے کیا کہ کل پھر دربار میں مسلمانوں سے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ان کا عقیدہ نمایاں کرایا جائے، ممکن ہے نجاشی کے اندر تعصب کی آگ بھڑک اٹھے۔ دوسرے دن دربار میں جا کر عمرو بن العاص نے یہی کیا اور بادشاہ کے کان بھرے کہ مسلمان حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کے متعلق بڑا خراب عقیدہ رکھتے ہیں۔ نجاشی نے دوبارہ مسلمانوں کو بلوایا اور ان سے پوچھا۔ مسلمانوں کا پھر یہی فیصلہ تھا کہ نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو، بات وہی کہی جائے جو حق

ہے حضرت جعفرؓ نے دربار میں کہا:۔

"ہمارے پیغمبر نے بتایا ہے کہ عیسٰی علیہ السلام خدا کے بندے اور پیغمبر ہیں اور کلمۃ اللہ ہیں"

نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اُٹھایا اور کہا! "واللہ! جو تم نے کہا ہے، عیسٰیؑ اُس سے اِس تنکے بھر بھی زیادہ نہیں ہیں" حکم دیا کہ تمام تحائف اہلِ مکّہ کو واپس کر دیے جائیں۔

مکّہ کے سفیر مُنہ لٹائے واپس آ گئے۔

تقریر نمبر ۷

حالات کا شدید مدوجزر

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کام جب ترقی کرتا ہے تو حاسدوں اور معاندوں کی مخالفت اور بڑھ جاتی ہے۔ یہی مکّہ میں ہوا۔ دو اہم شخصیتوں کا خدا پرستوں کی پارٹی میں آملنا جہاں قائدِ انسانیت اور آپؐ کے رفقا کے لیے باعث تقویت ہوا۔ وہاں تحریکِ اسلامی کی اس نئی جست نے محاذِ مخالف کو اور زیادہ متحرک کر دیا۔

حضورؐ کے محبوب چچا حضرت حمزہؓ دوسرے سرداروں کی طرح نہ عناد میں پڑے اور نہ کسی ظالمانہ کارروائی میں حصّہ لیا۔ مگر چونکہ ان کا مشغلہ زیادہ تر سیر و شکار تھا، اس وجہ سے دعوتِ نظامِ حق پر بھی پوری توجہ نہ ہوئی تھی۔ ایک دن حسبِ معمول شکار سے واپس آرہے تھے کہ عبداللہ بن جدعان کی لونڈی راستے میں ملی اور اس نے طعنہ دیتے ہوئے کہا۔ "ابو عمارہ! کاش تم تھوڑی دیر پہلے آتے تو دیکھتے کہ ابو جہل نے تمہارے بھتیجے محمدؐ کے ساتھ کیا سلوک کیا۔" پھر تفصیل بتائی کہ محمدؐ کوہِ صفا کے پاس سے گزر رہا تھا کہ ابو جہل نے اس پر سب و شتم کی بوچھاڑ کر دی۔ پھر اس پر مٹی اور گوبر پھینکا اور جسمانی ایذا بھی پہنچائی۔ وہ کہنے لگی! "افسوس کہ بنو ہاشم کے اس یتیم کی حمایت میں کوئی ہاتھ بلند نہیں ہوا!" حضرت حمزہؓ

جوشِ غضب کے عالم میں کمان ہاتھ میں لیے کعبہ کی طرف لپکے۔ ابوجہل ابھی وہیں تھا اور قریش کے حلقہ میں لاف زنی کر رہا تھا۔ حضرت حمزہؓ نے آگے بڑھ کر اپنی کمان اس زور سے اس کے سر پر ماری کہ وہ لہو لہان ہو گیا۔ ساتھ ہی کہا کہ "تم محمدؐ کو گالیاں دیتے ہو۔ آج سے میرا دین بھی وہی ہے جو محمدؐ کا ہے۔ تجھ میں ہمّت ہے تو مجھے اس سے روک کے دیکھ۔" بنو مخزوم کے کچھ لوگ ابوجہل کی حمایت کے لیے اُٹھے، مگر خود ابوجہل نے ان کو روکا کہ "ابو عمارہ کو چھوڑ دو، میں نے واقعی آج اس کے بھتیجے کو بہت گالیاں دی ہیں۔ اس لیے اس کو غصّہ آگیا ہے۔" یہاں سے حضرت حمزہؓ سیدھے حضورؐ کی خدمت میں پہنچے اور کہا کہ "بھتیجے خوش ہو جاؤ کہ میں نے عمرو بن ہشام سے تمہارا بدلہ لے لیا ہے۔" جواب ملا کہ "چچا جان میری خوشی تو اس میں ہے کہ آپ بُت پرستی ترک کر کے دینِ حق کو اختیار کر لیں۔" غور فرمایئے اپنے ذاتی جذبات کی تسکین کا کوئی شوق نہیں، حضورؐ کو صرف دین کی ترقی اور ایک قرابت دار انسان کی فلاح و سعادت منظور ہے۔ حضرت حمزہؓ رات بھر بہت مضطرب رہے۔ صبح رسولؐ اکرم کی خدمت میں جا کر دینِ حق کو قبول کر لیا۔

حضرت حمزہؓ کے اسلام کی خبر مشرکین مکّہ کے لیے رنج و اضطراب کا باعث ہوئی، مگر محمدؐی انقلاب کے علمبرداروں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

اس واقعہ کے ردِّ عمل نے ابوجہل کے عناد کو اور بھڑکا دیا۔ غیظ و غضب میں اس نے اعلان کر دیا کہ جو شخص محمدؐ کو قتل کر کے اس کا سر میرے پاس لائے گا، سو سُرخ اُونٹ یا ہزار اوقیہ چاندی انعام میں دُوں گا۔ خاص طور پر ابوجہل نے حضرت عمرؓ کو، جو اس کے نوجوان بھانجے تھے، بہت مشتعل کیا۔ عمرؓ تلوار سونت کر اُٹھے کہ اچھا میں اس کام کو انجام دُوں گا۔ سیدھے خانۂ ارقم کی طرف چلے۔ راستے میں ان کے ایک ہم قبیلہ دوست نعیم بن عبداللہ مل گئے۔ اُن کے پوچھنے پر حضرت عمرؓ نے بتایا کہ محمدؐ کو قتل کرنے جا رہا ہوں۔ نعیم نے کہا کہ پہلے اپنے گھر والوں کی تو خبر لو۔ عمرؓ نے حیرت سے پوچھا: "میرے کون سے گھر والے؟" نعیم نے بتایا کہ تمہاری بہن فاطمہؓ اور بہنوئی سعید بن زید دونوں مسلمان ہو چکے ہیں اور داعیٔ فلاحِ انسانیت کے پیروؤں میں شامل۔

حضرت عمرؓ نے خانۂ اَرقمؓ کا خیال چھوڑ کر اپنے بہنوئی کے گھر کا رُخ کیا۔ میاں بیوی دونوں حضرت خبّابؓ بن الارتؓ سے قرآن سیکھ رہے تھے۔ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ محسوس ہو گیا کہ یہ عمرؓ کی دستک ہے۔ خبّابؓ ابنُ الارت گھر کے پچھلے حصّے میں چلے گئے، قرآن کے اوراق حضرت فاطمہؓ نے چھپا دیے۔ پھر دروازہ کھول دیا گیا۔

حضرت عمرؓ نے غضبناک ہو کر کہا: میں نے سُنا ہے کہ تم دونوں مسلمان ہو گئے ہو۔ تمھیں اس حرکت کا مزا چکھانے آیا ہوں۔ پھر وہ حضرت سعیدؓ پر ٹوٹ پڑے۔ لمبے بال پکڑ کر ان کو زمین پر دے مارا اور بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا۔ حضرت فاطمہؓ شوہر کو چھڑانے کے لیے آگے بڑھیں تو بھائی کے ڈنڈے کی ایک ضرب فاطمہؓ کے چہرے پر پڑی۔ وہ لہولہان ہو گئیں۔ مگر عزم و ثبات کا یہ عالم تھا کہ پکار اُٹھیں: "ہاں ہم نے اسلام کو اختیار کر لیا ہے، رسول اللہؐ کی پیروی میں داخل ہو گئے ہیں۔ اب تو جو کچھ چاہے کر لے، یہ نقشِ ہدایت ہمارے سینوں سے نہیں مٹ سکتا۔"

خون میں نہائی ہوئی بہن نے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ یہ عزیمت مندانہ فقرہ کہا تو ہیرے کا جگر پھول کی پتی سے کٹ گیا۔ غصّہ کی جگہ ندامت نمودار ہو گئی۔ پیار سے کہنے لگے اچھّا تو جو کچھ تم پڑھ رہے تھے، مجھے بھی دکھاؤ۔ حضرت فاطمہؓ نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ تم اس کو ضائع کر دو گے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے معبودوں کی قسم کھا کر کہا کہ میں اسے پڑھ کر واپس کر دوں گا۔ حضرت فاطمہؓ کو اب کچھ امید بندھی کہ شاید بھائی ہدایت کی راہ اختیار کر لے۔ پھر اُنھوں نے کہا کہ عمرؓ! یہ خدا کا کلام ہے، جب تک تم غسل کر کے بدن پاک نہ کرو، اسے چھو نہیں سکتے۔"

حضرت عمرؓ نے غسل کیا۔ حضرت فاطمہؓ نے اوراق سامنے لا رکھے۔ روایات میں دو سورتوں کے نام ہیں۔ کہا گیا ہے کہ ان اوراق میں سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الحدید تھی۔ بہرحال بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھتے ہی ان کے جسم پر لرزہ طاری ہوا۔ پھر جُوں جُوں تلاوت کرتے گئے قرآن کی شوکتِ بیان اور فصاحت و بلاغت حضرت عمرؓ کو مسحور کرتی گئی، یہاں تک کہ وہ اشک آلود آنکھوں سے پکار اُٹھے: اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا الرَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

اب حضرت خبّاب بن الارتؓ سامنے آ گئے۔ اُنھوں نے کہا عمرؓ! مبارک! حضورؐ نے کل ہی دُعا مانگی تھی کہ الٰہی، عمرو بن ہشام (ابو جہل)، یا عمرؓ بن الخطاب میں سے جس کو تو چاہے، دائرہ اسلام میں بھیج!

حضرت خبّاب کے ساتھ عمرؓ دارِ ارقم پہنچے۔ داخل ہوئے تو حضورؐ نے پوچھا: عمرؓ! کس نیت سے آئے ہو؟ مرعوبیت کی کیفیت میں دھیمی آواز میں کہا: اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانے کے لیے! یہ سُن کر حضورؐ کے تمام صحابہ فرطِ مسرت سے اللہ اکبر پکار اُٹھے۔

دوسری روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام پہلے ہی سے حضرت عمرؓ کے دل میں راستہ بنا رہا تھا۔ ان کی اندرونی کش مکش ہی ان کو شدید ہیجان تک لے آئی، اور پھر واقعات نے یکایک ان کی کایا پلٹ دی۔ خاص بات یہ ہے کہ عین دورِ تشدّد کے نصف النہار میں حضرت عمرؓ اسلام لائے۔ عمرؓ جیسی شخصیت انقلاب سے دوچار ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ماحول میں کوئی نیا مدوجزر نہ پیدا ہو۔ اُنھوں نے غور کر کے اندازہ کیا کہ قریش میں جمیل بن مُعَمَّر جُمحی بات کو اچھی طرح پھیلا سکتا ہے۔ صُبح صُبح اس کے ہاں پہنچے اور اسے بتایا کہ میں محمدؐ کے دین میں داخل ہو گیا ہوں۔ جمیل جلدی سے چادر سمیٹتا مسجدِ حرام میں پہنچا اور گلا پھاڑ کر اعلان کیا کہ اے گروہِ قریش! عمرؓ بن خطاب صابی ہو گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پکار کر کہا، یہ غلط کہتا ہے، میں مسلمان ہوا ہوں۔ اہلِ قریش ان پر ٹوٹ پڑے۔ حضرت عمرؓ تن تنہا خوب لڑے۔ اسی اثنا میں ایک قریشی سردار عاص بن وائل سہمی پہنچا۔ اس نے معلوم کیا کہ معاملہ کیا ہے، بات سمجھ لی تو کہا کہ اس شخص نے اپنے لیے ایک راستہ پسند کر لیا ہے تو اب تم کیا چاہتے ہو۔ بنو عدی بن کعب سے لڑائی مول لیتے ہو؟ پھر اُنھوں نے حضرت عمرؓ کو اپنی پناہ میں لے لیا۔

حضرت عمرؓ نے مار تو کھائی مگر حرم میں علی الاعلان نماز ادا کرنے کا اعلان کر دیا۔ دوسرے مسلمان بھی نماز کے لیے حرم میں جمع ہونے لگے۔ حالات میں کتنی بڑی تبدیلی تھی!

دشمنانِ حق اپنی ساری تدبیروں کے علی الرغم یہ منظر دیکھ رہے تھے کہ حق کا سیلاب آگے ہی آگے بڑھ رہا ہے اور ایک انقلاب چپکے چپکے بڑی شخصیتوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ اب اُنھوں نے اس تبدیلی کے سامنے بند باندھنے کے لیے ایک نیا قدم اُٹھایا۔

ساتویں سالِ نبوت کے محرم میں مکّے کے تمام قبائل نے مل کر ایک معاہدہ کیا کہ خاندانِ بنو ہاشم سے مکمل بائیکاٹ کیا جائے، نہ ان سے قرابت رکھی جائے، نہ شادی بیاہ کا تعلق، نہ لین دین، نہ ملنا جلنا اور نہ کھانے پینے کا کوئی سامان ان تک پہنچنے دیا جائے۔ یہاں تک کہ بنو ہاشم محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو ہمارے سپرد کر دیں کہ ہم انھیں قتل کر دیں۔ معاہدہ تحریری تھا۔ یہ دور تین برس کے بعد ختم ہوا۔

بنو ہاشم بے بس ہو کر شعبِ ابی طالب میں پناہ گزیں ہو گئے۔ گویا پورا خاندان تحریکِ اسلامی کے داعیٔ اعظم کی وجہ سے ایک طرح کی قید یا نظر بندی میں ڈال دیا گیا۔ اس نظر بندی کا دَور تقریباً ۳ برس کا تھا۔ اس دور میں جو احوال گزرے ان کو جان کر پتھر بھی پگھلنے لگیں۔ درختوں کے پتّے تک کھائے گئے۔ سوکھے چمڑے کے ٹکڑے ابال ابال کر شکم پُری کی گئی۔ معصوم بچّے جب بھوک کے مارے بلکتے تو قریش ان کی آوازوں پہ خوشی سے جھوم اُٹھتے۔ ایک مرتبہ حکیم ابنِ حزام نے اپنی پھوپھی حضرت خدیجہؓ کی خدمت میں کچھ گیہوں اپنے غلام کے ہاتھ چوری چھپے بھیجے۔ راستہ میں ابوجہل نے دیکھ لیا اور گیہوں چھیننے کے درپے ہوا۔ ابوالبُختَرِی کا گزر ہوا۔ اس نے ابوجہل سے کہا کہ چھوڑ و بھی، بھتیجے نے پھوپھی کے لیے گیہوں بھیجے ہیں تو کیا ہوا۔ اسی طرح ہشام ابنِ عمرو بھی چوری چھپے نظر بندوں کے لیے کچھ غلہ بھجواتے۔

یہی ہشام بن عمرو اس ظالمانہ معاہدے کی تنسیخ کے لیے اُٹھا۔ اصل میں ایک ظلم جب مسلسل جاری رہتا ہے تو آہستہ آہستہ انسانی فطرت اس کے خلاف اچھے جذبات ابھار دیتی ہے۔ یہ شخص زُہیر بن ابی اُمیّہ کے پاس گیا اور بڑی موثر گفتگو کی۔ پھر اس نے مُطعِم بن عدی کے ساتھ ملاقات کی۔ پھر ابوالبختری اور زَمعَہ بن الاَسوَد کو ہموار کیا گیا۔

ہاشم نے اپنے حامیوں کے مشورے سے پوری اسکیم بنانے کے بعد ایک دن کعبہ کا طواف کیا اور فارغ ہو کر لوگوں کے مجمع کی طرف آیا اور کہا کہ مکّہ والو! کیا یہ زیبا ہے کہ ہم کھانے کھائیں اور لباس پہنیں اور بنو ہاشم بھوک سے تڑپ رہے ہوں مگر وہ کچھ خرید بھی نہ سکیں۔ پھر اس نے چیلنج کے طور پہ کہا کہ "خدا کی قسم! میں اس وقت تک نہ بیٹھوں گا، جب تک کہ تعلقات کو توڑ دینے والی اس ظالمانہ تحریر کو پارہ پارہ نہ کر دوں"۔

ابوجہل بھنا اُٹھا اور چیخ کر بولا: "جھوٹے ہو تم۔ خدا کی قسم! تم اسے پھاڑ نہیں سکتے"۔ زمعہ ابن الاسود نے ابوجہل کو جواب دیا: "تم خدا کی قسم، سب سے بڑھ کر جھوٹے ہو۔ یہ معاہدہ جس ڈھب سے لکھا گیا ہے، ہم اسے پسند نہیں کرتے"۔ ابوالبختری بھی بول پڑا: "ٹھیک کہتا ہے زمعہ ابن الاسود، نہ ہم اس کو پسند کرتے ہیں اور نہ اس کو مانتے ہیں"۔ مُطعِم نے بھی تائید کی۔ ہشام نے بھی تائید مزید کی۔ اکثریت کو یوں مخالف پاکر جب ابوجہل نے دیکھا کہ مٹی پاؤں تلے سے نکل گئی ہے تو وہ بے بس ہوگیا۔ اب معاہدے کو دیوارِ کعبہ سے لوگ اتارنے کو گئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اسے دیمک چاٹ چکی تھی۔ صرف "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ"، کے الفاظ باقی تھے۔ حفیظ جالندھری کے لفظوں میں ؎

جو فانی تھا سو فانی تھا، جو باقی تھا سو باقی تھا

دورِ نظربندی کا خاتمہ ہوگیا اور خدا کا وہ نبیؐ جو ساری انسانیت کا محسن تھا، اپنے گھرانے سمیت آزادی کی فضاؤں میں داخل ہوا۔ یہ نبوت کا دسواں سال تھا جب کہ پہلے سے بھی سخت تر دور کا آغاز ہونے والا تھا۔ اس سال میں اوّلیں سانحہ یہ پیش آیا کہ حضرت علیؓ کے والد جناب ابوطالب کی وفات ہوگئی۔ دوسرا صدمہ حضرت خدیجہؓ کی رحلت کا تھا۔ ابوطالب مخالفین کے مقابلے میں حضورؐ کے لیے ڈھال بنے رہے۔ حضرت خدیجہ محض حضورؐ کی بیوی ہی نہ تھیں، بلکہ اوّلیں مومنہ تھیں اور صحیح معنوں میں مونس وغمگسار۔ آخر دم تک سچی رفاقت کا حق ادا کرگئیں۔ تحریکِ اسلامی کے لیے مال بھی خرچ کیا۔ قدم قدم پر مشورے بھی دیے، ہمّت بھی دلائی، تعاون بھی کیا، اور انھی کے بطن سے حضورؐ کی اولاد ہوئی۔

ان دو ظاہری سہاروں کے ہٹ جانے کی وجہ سے مخالفت کا طوفان اور زیادہ شدّت پکڑ گیا۔ مشیت نے شاید یہ چاہا ہو کہ سچائی اپنا راستہ آپ بنائے۔ نیکی اپنی حفاظت خود کرے۔

مذکورہ دو غم انگیز واقعات کی وجہ سے اس سال کو عام الحزن یا سالِ اندوہ کہا جاتا ہے۔ اس سال کے بعد ظلم اور تضحیک کی کارروائیاں تیز تر کردی گئیں۔

اب قریش انتہائی ذلیل حرکتوں پر اُتر آئے۔ لونڈوں کے غول حضورؐ کے پیچھے لگا دیے

جاتے، جو شور مچاتے اور نماز کے دوران تالیاں پیٹتے اور سیٹیاں بجاتے۔ راستہ چلتے ہوئے حضورؐ پر غلاظت پھینک دی جاتی۔ گالیاں دی جاتیں، پھبتیاں کسی جاتیں۔ بعض خبیث الفطرت ایسے بھی تھے جو حضورؐ پر تھوک دیتے۔

ایک بار ابولہب کی بیوی اُمِ جمیل پتھر لیے حضورؐ کی جستجو میں حرم تک آئی کہ بس ایک ہی وار میں کام تمام کر دے۔ مگر حضورؐ کے موجود ہونے کے باوجود وہ نہ دیکھ سکی۔ اس نے یہ لغو شعر آپؐ کے بارے میں کہے۔

مُذَمَّمًا عَصَیْنَا وَ اَمْرَہٗ اَبَیْنَا وَ دِیْنَہٗ قَلَیْنَا

یعنی ہم نے مُذمّم شخص سے روگردانی کی، اس کی دعوت کا انکار کیا اور اس کے دین سے نفرت کی۔

حضورؐ کو محمدؐ کے بجائے مذمّم کہہ کر بھڑاس نکالی گئی تھی۔ اس پر حضورؐ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے سبّ وشتم سے مجھے یوں بچاتا ہے کہ یہ مذمّم کو گالی دیتے ہیں، جب کہ میرا نام محمدؐ ہے۔

ایک بار ابوجہل حضورؐ کو پتھر سے ہلاک کرنے کا اِرادہ کر کے پہنچا، مگر خدا نے ایسی ہیبت طاری کی کہ وہ کچھ نہ کر سکا۔

ایک مرتبہ پوری ٹولی بیٹھی تھی کہ حضورؐ کا گزر ہوا۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا تم ایسا اور ایسا کہتے ہو۔ حضورؐ نے حق پرستانہ جراٴت کے ساتھ کہا کہ ہاں میں ایسا کہتا ہوں۔ پوری ٹولی آپ پر ٹوٹ پڑی۔ جب حملہ آور رُک گئے تو پھر ان سے فرمایا کہ ”میں تمھیں پیغام دیتا ہوں کہ تم ذبح ہو جانے والے ہو“۔

حضرت عثمانؓ بن عفّان بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے۔ قریش کے چند سردار حطیم میں بیٹھے تھے۔ جب حضورؐ ان کے سامنے سے گزرتے تو وہ کلماتِ بد زبانوں پر لاتے۔ تین بار ایسا ہوا۔ آخری مرتبہ حضورؐ نے چہرۂ متغیّر کے ساتھ کہا کہ ”بخدا تم بغیر اس کے باز نہ آؤ گے کہ خدا کا عذاب جلد تم پر ٹوٹ پڑے“۔
حضرتِ عثمانؓ کہتے ہیں کہ ہیبتِ حق تھی کہ ان میں سے ہر شخص لرز رہا تھا۔ اپنی بات کہہ

کر حضورؐ گھر کو چلے تو حضرت عثمانؓ اور دوسرے لوگ ساتھ ہو لیے۔ اس موقع پر حضورؐ نے فرمایا:

”تم لوگوں کو بشارت ہو کہ اللہ تعالیٰ یقیناً اپنے دین کو غالب کریگا۔ اپنے دین کی مدد کرے گا اور یہ لوگ جنھیں تم دیکھتے ہو، اللہ ان کو بہت جلد تمھارے ہاتھوں سے ذبح کرائے گا۔“

بظاہر ماحول کتنا یاس انگیز تھا، مگر نگاہِ نبوت مستقبل کو دیکھ کر ایسے ہی ماحول میں ایک حتمی بشارت دے رہی تھی۔

تقریر نمبر ۸

سفرِ طائف

حضور محسنِ انسانیت، محمد صلی اللہ علیہ وسلّم ایک روز علی الصباح گھر سے نکلے اور فلاح و سلامتی کا خدائی پیغام سنانے کے لیے مختلف محلوں اور کوچوں میں پھرے، لیکن پورا دن اس طرح گزرا کہ آپ کو ایک شخص بھی ایسا نہ ملا جو بات سُنتا۔ مخالفین نے نئی اسکیم یہ بنائی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو جب کوئی آتا دیکھے تو اِدھر اُدھر سٹک جائے۔ اگر کوئی ملا بھی تو اُس نے استہزاء اور غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا جن کی بھلائی کے لیے حضورؐ کوچہ پیمائیاں کرتے تھے، وہ اپنے بھلے سے خود گریزاں تھے۔ اس روز جب آپ گھر واپس آئے تو طبیعت میں سخت گھٹن تھی۔

اس کے دوسرے معنیٰ یہ تھے کہ مکّہ کی کھیتی اب بنجر ہوتی جا رہی تھی۔ تمام جوہرِ قابل حضورؐ کے گرد سمٹ چکا تھا۔ باقی زیادہ تر کوڑا کرکٹ رہ گیا تھا۔ غالباً اسی تکلیف دہ تجربے کے زیرِ اثر آپؐ نے مکّہ سے باہر جا کر دعوت پھیلانے کا پروگرام بنایا۔ مکّہ دعوتِ حق کے لیے کچھ ایسا بنجر ہو گیا تھا کہ نیا میدان تلاش کرنے کے لیے ایک دن زیدؓ بن حارثہ کو ساتھ لے کر سرورِ عالمؐ طائف روانہ ہو گئے۔

یہ کٹھن سفر پیدل طے کیا اور راستے میں جو قبائل آباد تھے۔ ان کے سامنے فرمانِ روائے کائنات

کی ہدایت رکھی۔ آنے جانے میں قریباً ایک مہینہ لگ گیا۔

طائف بڑا سر سبز خطہ تھا۔ وہاں خوش حالی تھی، اس لیے خدا فراموشی اور اخلاق سے بے نیازی بھی زوروں پر تھی۔ پھر سود خوری کی عادت نے اہلِ طائف کے انسانی جذبات کو خاصا دبا دیا تھا۔

طائف پہنچ کر حضورؐ نے بنو ثقیف کے سرداروں سے ملاقات کی۔ یہ تھے عبد یالیل، مسعود اور حبیب۔ ایک کے گھر میں اہلِ قریش کی ایک عورت بنو جمح میں سے تھی۔ حضورؐ نے ان کو بڑی خوبصورتی سے اللہ تعالیٰ کے دین کی تلقین کی اور ان سے حمایت طلب کی۔ یہ بالکل اُلٹی کھوپڑی کے نکلے۔ ایک نے کہا: "اگر واقعی خدا نے ہی تم کو بھیجا ہے تو پھر وہ کعبہ کا غلاف پارہ پارہ کرانا چاہتا ہے۔" دوسرا بولا: "ارے، کیا خدا کو تمھارے علاوہ رسالت کے لیے کوئی مناسب آدمی نہ مل سکا۔" اور تیسرے نے یوں زبان کھولی: "میں تو تم سے بات نہیں کروں گا۔ اگر تم واقعی رسول ہو تو تم ایسے آدمی کو جواب دینا بے ادبی ہے، اور اگر تم نے خدا پر افترا باندھا ہے تو تم اس قابل نہیں ہو کہ بات کی جائے۔"

زہر میں بجھے ہوئے یہ تیر حضورؐ کے ذہن میں گڑ گئے، مگر آپ نے بڑے تحمل سے فرمایا کہ اچھا، خیر، تم اپنی یہ باتیں اپنے ہی تک رکھو اور عام لوگوں میں نہ پھیلاؤ۔

مگر ان ستمگروں نے اپنے ہاں کے گھٹیا اور بازاری لونڈوں اور نوکروں اور غلاموں کو ہُشکا کر آپ کے پیچھے لگا دیا کہ جاؤ اس شخص کو بستی سے نکال آؤ۔ غنڈوں کی ٹولی آپؐ کے آس پاس جمع ہو گئی۔ گالیاں دینے اور تالیاں پیٹنے کے علاوہ یہ لوگ حضورؐ پر پتھر برسا رہے تھے۔ خاص طور سے تاک کر ٹخنوں پر مارتے تاکہ زیادہ اذیت پہنچے۔ حضورؐ جب نڈھال ہو کر بیٹھ جاتے تو طائف کے غنڈے بازو سے پکڑ کر اٹھا دیتے۔ پھر وہی سنگ باری اور دلآزاری۔ خون بہت بہہ رہا تھا اور حضورؐ کی جوتیاں اندر باہر سے لہو سے بھر گئیں۔ ایک ہجوم تماشائیوں کا بھی جمع ہو گیا۔ سردارانِ ثقیف کی غنڈہ ٹیم نے آپؐ کو شہر سے نکال کر عُتبہ اور شَیبہ کے باغ تک پہنچا دیا۔ آپؐ نے بالکل بے دم ہو کر انگور کی ایک بیل کے تنے سے ٹیک لگائی۔ زید بن حارثہ نے کچھ خون صاف کیا، کچھ بدن کو سہلایا۔ باغ کے مالک آپؐ کو کچھ دُور سے دیکھ رہے تھے اور جو افسوس ناک واقعہ گزرا تھا اسے بھی کسی قدر دیکھ چکے تھے۔ اسی موقع پر آپؐ

نے اپنی مشہور طویل دُعا پڑھی جس کا ایک حصّہ یہ ہے،

"الٰہی! اپنی قوّت کی کمی، اپنی بے سرو سامانی اور لوگوں کے مقابلے میں اپنی بے بسی کی فریاد تجھی سے کرتا ہوں۔ تو ہی میرا مالک ہے، آخر تو مجھے کس کے حوالے کرنے والا ہے؟ کیا اُس حریف کے، جو مجھ سے تُرش روئی کے ساتھ پیش آتا ہے، یا ایسے دُشمن کے جو میرے معاملے پر قابو پائے ہوئے ہے؟ لیکن اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں تو پھر مجھے کچھ پروا نہیں۔ تیرے ہی نورِ جمال کی پناہ طلب کرتا ہوں جس سے ساری تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور جس کے ذریعے دین و دنیا کے جملہ معاملات سنور جاتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ بجز تیرے، کہیں سے کوئی قوّت و طاقت نہیں مل سکتی۔"

باغ کے مالکوں نے اپنے غلام عدّاس کے ہاتھ ایک طشتری میں انگور بھجوائے۔ آپؐ نے بسم اللہ پڑھ کر ہاتھ بڑھایا تو یہ الفاظ سُن کر غلام حیران ہوا، پھر جب اسے باتوں باتوں میں حضورؐ کے نبی ہونے کا علم ہوا تو ہاتھ پاؤں چومنے لگا۔ ایک رنگ طائف کے سرداروں کا تھا اور ایک نمونہ اس غلام کا! غلام جب واپس باغ والوں کے پاس پہنچا تو اُنھوں نے اسے ڈانٹا کہ تم ہاتھ پاؤں کیوں چوم رہے تھے۔ دیکھو، اپنے دین سے نہ پھر جانا۔ عدّاس نے کہا کہ "اس سے بڑھ کر زمین میں کوئی چیز بھلی نہیں۔ اس شخص نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے جسے نبیؐ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔"

دہاں سے زید بن حارثہؓ نے آپؐ کو کندھوں پر اُٹھا کر قَرنُ الثَّعلب کے مقام تک پہنچایا، جہاں خون کو دھویا اور آپؐ نے کچھ آرام لیا۔ یہاں زید بن حارثہؓ نے عرض کیا کہ طائف والوں کے لیے بددُعا کیجیے۔ حضورؐ نے انکار فرما دیا اور مستقبل کا تصوّر کر کے ارشاد کیا کہ اگر یہ لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے تو اُمید ہے کہ ان کی نسلیں ضرور خدائے واحد کی پرستار ہوں گی۔ سوچیے! کتنے لوگ ہوں گے جو کسی کے حق میں نیکی کرنے جائیں اور آگے سے توہین آمیز ظالمانہ سلوک ہو تو پھر بھی ان کے جذبات میں کوئی اشتعال نہ آئے اور کوئی جذبۂ انتقام نہ اُبھرے۔ ایک اسی واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسانیت کی خدمت کرنے کے لیے جو ہستی اُٹھی

تھی وہ کتنی عظیم دبرتر تھی۔

قرن الثعلب سے دو افراد کا یہ قافلہ نخلہ کو روانہ ہوا۔ یہاں کسی موقع پر جبریل آئے اور بتایا کہ پہاڑوں کا انچارج فرشتہ حاضر ہے۔ اگر آپؐ اشارہ کریں تو وہ اِدھر اور اُدھر کے پہاڑوں کو ملا دے اور مکّہ اور طائف دونوں کو پیس کر رکھ دے۔ مگر آپؐ نے یہ پیش کش قبول نہیں فرمائی۔

پھر اسی سفر میں ایک مقام پر جنّوں کی ایک جماعت آکر قرآن سُنتی ہے اور حضورؐ کے ہاتھ پر ایمان لاتی ہے۔ اس طرح خدا نے حضورؐ پر یہ واضح کیا کہ اگر تمام انسان دعوتِ حق کو ردّ کر دیں تو ہماری اور مخلوقات ایسی موجود ہیں جو آپ کی دعوت پر لبیک کہیں گی۔

نبی اکرمؐ کئی دن نخلہ کے مقام پر رہے، پھر وہاں سے چلے تو سیدھے غارِ حرا میں پہنچے۔ یہاں سے مُطعِم ابنِ عدی کی حمایت میں آپؐ حرم میں تشریف لائے جب کہ عدی کے بیٹے ہتھیار لگا کر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ شہر میں آکر پہلے آپؐ نے حرم میں نماز ادا کی پھر گھر تشریف لے گئے۔

طائف میں حضورؐ پر جو گزری، تاریخ کے اجمال نے اسے چند لفظوں میں سمیٹ کر ہم تک پہنچایا ہے۔ ان لفظوں سے ہم اُس کرب کا اندازہ نہیں کر سکتے جو حضورؐ کو وہاں کے سرداروں کی گھٹیا گفتگو اور غیر انسانی سلوک سے پہنچا، اور نہ ان زخموں کی ٹیسوں کو اپنے جسموں میں محسوس کر سکتے ہیں جو ٹخنوں پر لگنے والے پتھروں کا نتیجہ تھے۔ ایک بار حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا کہ یارسُول اللہ! "کیا آپؐ پر اُحد کے دن سے بھی سخت دن کوئی گزرا ہے؟" فرمایا "تیری قوم کی طرف سے اور تو جو تکلیفیں پہنچیں سو پہنچیں، مگر سب سے بڑھ کر سخت دن وہ تھا جب میں نے طائف میں عبد یا لیل کے بیٹے کے سامنے دعوت رکھی اور اس نے اسے رد کر دیا۔ اس درجہ صدمہ ہوا کہ قَرنُ الثعلب کے مقام تک جا کر بمشکل طبیعت سنبھلی۔"

طائف سے واپس آکر حضورؐ محسن انسانیت محمّد صلی اللہ علیہ وسلّم بجائے اسکے کہ دل شکستہ

ہوکر بیٹھ رہتے، آپؐ نے اور زیادہ سرگرمی سے کام شروع کر دیا۔ خدا کے اولوالعزم پیغمبر جو دنیا بھر کے خیر خواہ ہوتے ہیں اور پوری نوعِ انسانی کے لیے فلاح و سعادت کی راہیں کھولنے کو اُٹھتے ہیں، ان کی عزیمت و بصیرت ایک راستہ بند ہونے پر نیا راستہ نکال لیتی ہے۔

حضورؐ نے جب مکّہ کے بعد طائف کو بھی بنجر پایا تو یہ طریقہ اختیار کیا کہ شہر مکّہ سے باہر کسی بھی ایسے راستے پر نکل جاتے جس پر آمد و رفت ہوتی ہو۔ کوئی بھی مسافر باہر سے آتا، اسے اپنا مقام اور پیغام بتلاتے۔ اور کبھی کسی مضافاتی بستی میں جا کر وہاں کے قبیلے کے سردار سے بات کرتے۔ نیز مکّے کے ارد گرد کے ۱۴، ۱۵ قبائل تک اپنی دعوت پہنچائی۔

اس زمانے میں آپ قبیلۂ کِندہ کی بستی میں چلے گئے۔ قبیلہ کا سردار ملیح تھا۔ اسی طرح قبیلۂ ابو عبداللہ تک بھی پہنچے۔ وہاں بڑے دلچسپ طریقے سے گفتگو کی۔ فرمایا: تم لوگوں کے جدِّ اعلیٰ کا نام عبداللہ تھا۔ تم اس نام کی لاج رکھو، اور اس نام کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال لو۔

پھر کسی موقع پر آپؐ قبیلۂ بنو حنیفہ کے علاقے میں پہنچے۔ اس قبیلے والوں نے آپؐ کے ساتھ طائف والوں سے بھی بڑھ کر بُرا سلوک کیا۔ یاد رہے کہ مُسیلمہ کذاب، جس نے بعد میں نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا، اسی قبیلے کا سردار تھا۔

باقی مختلف قبائل کے لوگوں سے موسمِ حج میں، ان کی قیام گاہوں پر جا جا کر ان سے ملاقاتیں کیں اور دعوت دی۔ یہ سلسلہ پہلے کی طرح جاری رہا۔

زمانہ و وقت کی بحث سے قطع نظر، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ بنو عامر بن صعصعہ کے پاس گئے اور ان کے سردار بَیحَرہ ابن فراس کو اسلام کی دعوت دی۔ بَیحَرہ نے پوچھا کہ اگر میں آپؐ کا ساتھ دوں اور آپؐ کو مخالفین پر غلبہ حاصل ہو جائے تو کیا آپؐ کے بعد حکومت مجھے ملے گی؟ حضورؐ نے جواب دیا کہ "یہ تو اللہ کے اختیار میں ہے، وہ جسے چاہے گا میرا جانشین بنا دے گا۔" دراصل بَیحَرہ بن فراس حضورؐ کی دعوت کا یہ مفہوم سمجھ رہا تھا کہ اس کے نتیجے میں حضور کی حکومت قائم ہو سکتی ہے۔ حضورؐ نے سیاسی سودا بازی سے انکار کر دیا۔ کیونکہ دینِ برحق کوئی متاعِ سوداگرانہ نہیں ہے۔

قبیلہ بنو ذُہل بن شیبان نے اسلام کے پیغام کو خوب توجہ سے سُنا، حضورؐ کی بہت عزت

کی۔حضرت ابو بکر صدیقؓ بھی ہمراہ تھے۔ حضرت صدیقؓ نے سردارِ قبیلہ مفروق سے حضورؐ کا تعارف کرایا کہ جس نبیؐ کا چرچا ہر طرف ہے، وہ یہی ہیں۔ مفروق نے حضورؐ سے پوچھا کہ آپ کا پیغام کیا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا: "یہ کہ اللہ ایک ہے، اور میں اس کا رسول ہوں۔" پھر سورۂ انعام کی آیت ۱۵۲ (قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ) کی تلاوت فرمائی۔ مفروق کے ساتھ سردار مثنیٰ اور ہانی بن قبیصہ بھی تھے۔ سب نے کہا کہ "کلام بہت اچھا ہے لیکن ہمارے لیے یکایک اپنے اعتقادات بدل لینا، اور اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ دینا بہت مشکل ہے۔ اس کے علاوہ کسریٰ سے ہمارا معاہدہ ہے کہ ہم اس کے سوا کسی کے زیرِ اثر نہ ہوں گے۔" آنحضورؐ نے ان کی راست گفتاری کو بہت پسند فرمایا اور کہا کہ "اپنے دین کی اللہ آپ مدد کریگا"

۱۴، ۱۵ قبائل تک آپؐ جذبۂ بےتاب سے اپنی دعوت پہنچانے گئے۔ مگر ان قبائل کی بدبختی کہ ان میں سے کوئی فرد بھی ایمان نہ لایا۔ گویا بظاہر اتنی بڑی تگ و تاز بے اثر جا رہی تھی۔ اس کے باوجود کبھی بھی اسلام کے نظامِ رحمت کے داعیٔ اعلیٰ پر بے دلی اور مایوسی کی کیفیت طاری نہیں ہوئی جو عملی مساعی کو روکنے کا باعث بنے۔

اذیتیں جب اپنے معیار کو پہنچ گئیں اور تگ و تاز کے باوجود معاشرے کی کھیتی میں دعوت کی تخم ریزی کرنے سے روئیدگی کا سلسلہ ختم ہو گیا تو اس کے صاف معنی یہ تھے کہ اب کوئی بڑا واقعہ ہونے والا ہے۔

تقریر نمبر ۹

واقعہ معراج

قاعدہ ہے کہ جب حق کے دشمنوں کی ایذا رسانی حد سے بڑھ جاتی ہے اور جب دُکھ اُٹھانے والے خدا پرستوں کی روحیں پکارتی ہیں کہ "خدا کی مدد کب آئے گی" تو انھیں جواب ملتا ہے کہ "بس اب خدا کی مدد قریب آگئی ہے"۔ اسی اصول کے مطابق معراج کی عظیم الشان تقریب میں خدا کی طرف سے حضورؐ کو مستقبل کے لیے واضح بشارتیں اور ہدایات دی گئیں۔

معراج کی حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ کو قربِ الٰہی کا بلند مقام نصیب ہوا، عالمِ غیب کی سیر کرائی گئی، خاص خاص آیات و نشانات کا مشاہدہ کرایا گیا اور آنے والے دورِ نو کے لیے ہدایات دی گئیں۔

معراج ایک بڑا معجزہ ہے۔ حضورؐ کو بہت سے معجزات دیے گئے لیکن مخالفین کی طرف سے بار بار کے مطالبۂ معجزات پر بالعموم انکار کر دیا گیا۔ کیونکہ معجزہ دیکھ کر مخالفین ایمان نہیں لاتے بلکہ اسے جادو کہہ کر مستوجب سزا ہو جاتے ہیں۔ دعوتِ محمدیؐ کا اصل زور استدلال پر تھا، بہترین انسانی جذبات کو اپیل کرنے پر، کافرانہ و مشرکانہ زندگی کی خرابیاں واضح کرنے پر، خدا پرستانہ کردار کا مظاہرہ کرنے پر اور مظالم کے مقابلے میں صبر دکھانے پر۔ کوشش یہ کی گئی کہ لوگ

حق کو چھانٹ پرکھ کر، اور حق کو حق سمجھ کر مانیں، اور باطل کو باطل سمجھ کر چھوڑیں۔ تاہم جہاں اور جب اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا حضورؐ کو معجزات سے نوازا اور اہلِ ایمان اور ان کے مخالفین نے اپنے مزاج اور ظرف کے مطابق ان سے اثر لیا۔

معراج کا واقعہ ۵۰ھ میلادی اور ۱۰ھ بعثت میں پیش آیا۔ صحیح تاریخ کے تعین میں اختلافات حائل ہیں۔ بروایت مشہور تاریخ ۲۷، رجب تھی اور دن دوشنبہ کا۔ آنحضورؐ ام ہانیؓ کے مکان پر استراحت فرما تھے کہ جبریل آئے، آپؐ کو جگا کر ساتھ لے گئے۔ حرم میں شق صدر کر کے سینے کو پاک کیا اور وہ ایمان و حکمت سے بھر گیا۔ پھر سواری کے لیے براق نامی ایک جانور پیش کیا۔ وہ اتنا تیز رفتار تھا کہ اِدھر حضورؐ اس پر سوار ہوئے اور اُدھر بیت المقدس جا پہنچے۔ یہ گویا پہلی منزل تھی جہاں لانے کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کی جس بین الاقوامی تحریکِ خیر و فلاح کا احیا کرنے کے لیے آخری پیغمبر اُٹھا تھا، اس تحریک کا ایک بڑا دیرینہ مرکز اسے دکھا دیا جائے اور سابق قائدینِ دعوتِ حق سے ملاقات کرائی جائے۔ مسجدِ اقصیٰ میں پچھلے تمام انبیاءؑ جمع تھے۔ اُنھوں نے محبّت سے استقبال کیا اور دو رکعت نمازِ باجماعت ادا کی گئی جس کی امامت نبی آخر الزماںؐ نے کی۔

خیر نماز ہو چکی تو جبریل حضورؐ کو سوار کرا کے آسمانوں پر لے چلے۔ آخر تک مختلف افلاک کے دروازے خاص طور سے کھولے جاتے رہے۔ مختلف آسمانوں پر حضرت آدمؑ، حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسٰیؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت ادریسؑ، حضرت ہارونؑ اور حضرت موسیٰؑ اور آخر میں حضرت ابراہیمؑ سے خاص ملاقاتیں ہوئیں۔

سفرِ معراج میں رسولِ برحقؐ کو مختلف جرائم کے مجرمین کو عبرت ناک سزاؤں میں مبتلا دکھایا گیا۔

پھر جب قربِ خاص کا انتہائی مقام آیا تو قرآن کے دیے ہوئے علم کے مطابق حضورؐ پر خاص وحی کی گئی (فاوحی اِلیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ)۔ یہ وحی کیا تھی؟ اسے قرآن میں تلاش کریں تو سورۂ بقرہ کی آخری آیتوں کے علاوہ وہ زیادہ تر سورۂ بنی اسرائیل میں مذکور ہے جس کا آغاز ہی تذکرۂ اسراء سے ہوتا ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں مستقبل کی یہ خوشخبری شامل ہے کہ محمدیؐ انقلاب کامیاب ہو گا، حق کا غلبہ ہو جائے گا اور باطل میدان چھوڑ دے گا۔

اس میں یہ واضح اشارہ بھی موجود ہے کہ مکہ والے حضورؐ اور آپؐ کے رفقا کو ہجرت پر مجبور کر دیں گے۔ سو ہجرت کی دُعا کی تعلیم دی گئی۔ ہجرت کے بعد دورِ جہاد آئے گا۔

یہود کو براہِ راست صاف صاف کہہ دیا گیا کہ تمھیں اپنے اعمال بد کی وجہ سے امامتِ عالم اور قیادتِ انسانیت سے معزول کیا جا رہا ہے۔ اب تمھارے لیے ایک ہی موقع ہے۔ تم اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لا کر اُن کا ساتھ دو تو بچ نکلو گے، ورنہ بُرا حال ہو گا۔

کفارِ مکہ کو بھی تنبیہ کی گئی کہ اب وہ جو رویہ اللہ کے رسولؐ کی دعوت کے مقابلے میں اختیار کریں گے، اسی کے مطابق ان سے معاملہ کیا جائے گا۔ فیصلے کی گھڑی اب قریب آگئی ہے۔

اس موقع پر خدا کی طرف سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو اسلامی نظامِ تمدن و معاشرت کے وہ اساسی اصول بتائے گئے جن کے مطابق اسلامی ریاست کو کام کرنا ہو گا۔ ان اصولوں کا اجمالی خاکہ یہ ہے:

(۱) اللہ کی توحید پر کامل یقین رکھو اور شرک سے اجتناب کرو۔

(۲) ماں باپ کی عزت و اطاعت کرو۔

(۳) رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں کے حقوق ادا کرو اور ناروا طور پر مال صرف نہ کرو۔

(۴) اگر حق داروں کی خدمت کا سلسلہ کسی مجبوری سے رُک جائے تو خوبصورتی سے اُن سے معذرت کرو۔

(۵) صَرفِ مال اور انفاق دونوں صورتوں میں مسلکِ اعتدال پر چلو۔

(۶) افلاس کے ڈر سے نسل کُشی (قتلِ اولاد) نہ کرو۔

(۷) زنا سے شدید اجتناب کرو، اور گندے کام کے قریب بھی نہ پھٹکو۔

(۸) ناروا طور پر کسی کی جان نہ لو۔

(۹) نابالغ یتیموں کے اموال کا تحفظ کرو۔

(۱۰) اپنے وعدوں اور معاہدوں کی پابندی کرو۔

(۱۱) لین دین میں ناپ تول کے پیمانے، ترازو اور باٹ درست رکھو۔

(۱۲) جو بات تمھارے علم کے دائرے سے خارج ہو اس کے پیچھے نہ پڑو، کیونکہ انسان کو سماعت، بصارت اور ذہن و قلب کا حساب خدا کو دینا ہے۔

(۱۳) زمین پر گھمنڈ کی چال نہ چلو۔

معراج کے موقعے پر عطا کردہ یہی وہ خدائی اصول تھے جن پر حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے نمونے کی اسلامی ریاست کو قائم کیا۔ حضورؐ کے بعد بھی مجدّدین و صلحا اور سلاطینِ عادل کے سامنے یہی اُصول تھے اور آئندہ بھی جہاں کہیں اسلامی نظام کا احیا ہوگا انھی اصولوں کو بنیاد بنانا ہوگا۔

ملاءِ اعلیٰ پر تجلیاتِ الٰہیہ کے درمیان جب حضورؐ کو ان اصولوں پر مشتمل فرمان دیا گیا ہوگا تو آپؐ کو مستقبل کے اُفق سے روشنی کا سیلاب اُمڈتا دکھائی دیتا ہوگا۔ کوئی مادّہ پرست مکّہ اور طائف کے یاس انگیز ماحول میں ہوتا تو شاید وہ مایوس ہو کر اپنی سرگرمیوں کی بساط لپیٹ چکا ہوتا، لیکن یہ محسنِ انسانیت کی پیغمبرانہ بصیرت تھی جو تجلیات و بشارات الٰہیہ سے سیراب ہو کر یہ محسوس کر رہی تھی کہ صبح آ رہی ہے۔

عرشِ الٰہی سے محسنِ انسانیت کو دوسرا تحفہ پنجگانہ نماز کا ملا۔ اب تک صرف دو وقت دو دو رکعت نماز پڑھی جاتی تھی۔ مشہور روایات ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے روزانہ پچاس نمازوں کی فرضیت کا حکم دیا۔ حضورؐ واپس ہوئے تو حضرت موسیٰؑ سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے بات سُنی تو اپنی اُمت کے احوال کا تجربہ ہونے کی وجہ سے کہا کہ "واپس جائیے اور کم کرائیے"۔ حضورؐ واپس گئے، پھر کچھ کمی ہوگئی۔ حضرت موسیٰؑ نے پھر واپس بھیجا۔ غرضیکہ دو تین بار جانے پر یومیہ پانچ نمازیں فرض کی گئیں۔ حضرت موسیٰؑ نے پھر مشورہ دیا کہ مزید کمی کرائیے۔ مگر حضورؐ نے فرمایا کہ اب مجھے مزید کچھ کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ [1]

---

[1] بعض لوگ جو حقائق شناس نہیں ہیں اعتراض کرتے ہیں کہ اس ردوکد کا مقصد کیا تھا؟ اس کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظاہر کیا گیا کہ انسان کو جو مقام اپنے رب کے سامنے حاصل

اس مبارک موقع پر خاص طور سے آنحضورؐ کو نمازِ تہجّد ادا کرنے کا حکم دیا گیا اور خوشخبری بھی دی گئی کہ اس کے ذریعے آپؐ "مقامِ محمود" تک پہنچیں گے۔

آیاتِ الٰہی اور تجلیاتِ الٰہی سے بہرہ مند ہو کر جب آپؐ واپس ہوئے تو اولاً بیت المقدس میں ہی اترے۔ پھر وہاں سے بُراق پر سوار ہو کر طلوعِ سحر سے پہلے مکّہ مکرمہ پہنچ گئے۔ صبح صبح جب آپؐ نے واقعۂ معراج کا تذکرہ قریش کے سامنے کیا تو اُنھوں نے پہلے تو تعجّب کیا، پھر مذاق اڑانے کے لیے تالیاں بجائیں۔ قریش میں سے جو لوگ بیت المقدس کو دیکھ چکے تھے اُنھوں نے بطورِ امتحان وہاں کے نشانات و علامات پوچھے۔ جو سوال پوچھے گئے، ان کے صحیح جواب آپؐ نے دیے۔ پھر پوچھا گیا کہ راستہ کا کوئی واقعہ بتایئے۔ فرمایا کہ فلاں مقام پر ایک تجارتی قافلہ دیکھا جو شام سے مکّہ آ رہا تھا، اس قافلے کا ایک اُونٹ گم ہو گیا، جو بعد میں تلاش کرتے کرتے ان کو مل گیا۔ وہ قافلہ انشاءاللہ تین دن تک مکّہ پہنچ جائے گا، اور ایک خاکستری رنگ کا اونٹ سب سے آگے ہوگا۔ تیسرے دن یہی ہوا۔ مگر دشمنانِ حق پھر بھی مخالفت ہی پر جمے رہے۔

(بقیہ حاشیہ از ص ۶۹)

ہے اور اسکی جن بے شمار نعمتوں ـــــ زندگی سے لے کر ایمان تک اور ہوا پانی سے لے کر گردشِ شمس و قمر اور تغیرِ روز و شب تک ـــــ سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ ان کی وجہ سے حق یہی آتا ہے کہ وہ دن رات میں ۵ مرتبہ اپنے رب کے سامنے اپنے آپ کو جُھکا کر خدا کا شکر اور ذکر کرے۔ دوسری طرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء اپنی اُمتوں کے لیے کتنے شفیق ہوتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ بار بار جو مشورہ دیتے ہیں حضورؐ اس کے مطابق باری تعالیٰ سے کمی کی درخواست کرتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ حضورؐ کا فرمانا کہ اب مزید کمی کیلئے کہتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ اس میں یہ تعلیم مضمر ہے کہ خدا کی عبادت میں حد سے زیادہ کمی یا رخصت طلب کرنا بھی مقامِ بندگی کے منافی ہے۔ نیز یہ کہ ۵ نمازوں کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے پر پرستانِ حق کو شرم آنی چاہیے۔ چوتھے اپنے پیغمبر صادق و مصدوق نے نمازوں میں کمی کرانے کے لیے جو کوشش کی ہے اس کی قدر کرتے ہوئے نمازِ پنجگانہ کی ادائیگی میں ہمیں کوئی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔ پانچویں یہ کہ اب روز کی ۵ نمازیں ادا کرنا بلحاظِ ثواب ۵۰ نمازیں ادا کرنے کے برابر محسوب ہوگا۔

اِدھر یہ قصّہ ہوا، اُدھر کچھ لوگ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے پاس گئے اور اُنھیں بتایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کہتے ہیں کہ میں آج کی رات بیت المقدس گیا اور صبح سے پہلے واپس آگیا۔ کیا آپؐ اس دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔ حضرت صدیق رضؓ نے ان لوگوں سے کہا کہ اگر رسولِ برحق صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایسا ہی فرمایا ہے تو بالکل سچ فرمایا۔ میں تو اس سے بڑھ کر حضورؐ کی بیان کردہ خبروں کی دن رات تصدیق کرتا ہوں۔ دیکھا آپؐ نے رسول کو جب ایک بار رسول مان لیا تو پھر اس کے ہر ارشاد پر شک و شبہ میں پڑنا اور دلیلیں طلب کرنا ایمان والوں کا کام نہیں۔

پردۂ غیب کے پیچھے جس صاحبِ قلب و نظر نے فرمان روائے کائنات کی خاص آیات و تجلیات کا مشاہدہ کیا ہو، اور عالمِ آخرت کی ایک جھلک دیکھ لی ہو، اس کے لیے پھر اس ذرا سی دنیا کے چھوٹے سے دورِ عمر میں مصائب و شدائد سے سابقہ پڑنا کیا اہمیت رکھتا ہے۔ یوں بھی حضورؐ کا ایمان ساری دنیا سے زیادہ روشن اور محکم تھا، پھر آپؐ کے پاس فرشتے آتے تھے، وحی اُترتی تھی، اس کے بعد کیا وقعت رہ جاتی ہے کسی دُشمن قوت کی گالیوں اور شرارتوں کی، پھر خدا کا مزید کرم ہوا کہ سفرِ معراج میں وہ کچھ دکھا دیا گیا جس کا ذکر قرآن میں ہے اور جس کی تبلیغ و تلقین ہر روز آپؐ فرماتے تھے، تو ایسی ہستی کی نگاہ میں تو راستہ میں رکاوٹ بننے والا پہاڑ بھی رائی کے دانے سے زیادہ اہمیت نہیں پا سکتا تھا اور نہ اسے مایوسی زیر کر سکتی ہے۔

اور حضورؐ کے سامنے بہت ہی شاندار روشن مستقبل روز بہ روز قریب تر ہو رہا تھا! ؎

تقریر نمبر ۱۰

بیعت عَقَبَہ اُولیٰ و ثانیہ

معراج کے دوران جو آیات و تجلیات حضورؐ کی نظر سے گزریں، وہ حضورؐ اور اہل ایمان کے عزم و ہمت میں اضافہ کا سبب بنیں، اور جو وحی اس مرحلے میں کی گئی اُس نے مستقبل کے نشاناتِ راہ کو اجاگر کر کے نیکی اور سچائی کی تحریک میں نئی حرکت پیدا کر دی۔

مکّہ میں ایمان و اخلاق کی روئیدگی ختم ہو جانے کے بعد، حضورؐ طائف سے پوچھنے گئے تھے کہ آیا تم سچائی کی مشعل اُٹھا سکتے ہو؟ طائف نے جواب دیا کہ میں تو مکّہ سے بھی بڑھ کر نا اہل ہوں۔ حضورؐ کے ایک کان میں طائف کی "نہ" کی آواز پہنچی ہی تھی کہ دوسرے کان کے پردوں سے یثرب کی بہت دھیمی سی آواز بہت دُور سے آ کر ٹکرائی کہ میں مدینۃ النبی اور مرکزِ دینِ حق بننے کو تیار ہوں۔ میں نورِ حق کی مشعل کو اٹھاؤں گا۔ ساری دنیا تک روشنی پہنچاؤں گا۔ میری گود میں نیکی کا نظام پرورش پائے گا اور میرے گہواروں میں نئی تاریخ پروان چڑھے گی۔

مکّہ اور طائف قریب تھے مگر دُور ہو گئے۔ یثرب دُور تھا مگر قریب آ گیا۔

رسولِ اکرم صلی اللہ وسلّم کو خواب میں ایک ایسا دارالہجرت دکھایا گیا تھا جہاں

باغات تھے اور کھجوروں کے جھنڈ۔ پانی اور سایہ۔ مگر بات ابھی اشارے ہی تک محدود تھی۔

مدینہ کو یہ سعادت اس لیے ملی کہ وہاں کے باشندوں ۔اوس و خزرج ۔ نے اسلام کے لیے دل و نظر کے دروازے خوشی خوشی کھول دیے، جیسے تپتے صحرا کے پیاسے مسافر بارانِ رحمت کا انتظار کر رہے ہوں۔ واقعی وہ انتظار ہی کر رہے تھے۔ مدینہ میں یہود کا خاصا غلبہ تھا۔ ان کے ۲۰، ۲۱ قبیلے تھے، مضافات کی بستیاں اُن کی تھیں، اُن کے پاس دولت تھی اور وہ سود خوری کرتے تھے۔ یہود اور اوس و خزرج پہلے ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہے، پھر معاہدہ کر کے حلیف بن گئے، پھر یہود نے معاہدہ توڑ دیا۔ اِدھر اوس و خزرج میں خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں۔ خصوصاً جنگِ بُعاث میں دونوں خاندانوں کے نامور سردار مارے گئے۔

یہودیوں سے ایک عیاش رئیس فِطیون نامی اُٹھا جس نے فرمان جاری کیا کہ اس کے حدودِ اثر میں جو لڑکی بھی بیاہی جائے وہ اس کے شبستانِ عیش سے گزر کر ازدواجی زندگی کے دائرے میں قدم رکھے۔ یہود نے بے چون و چرا اس حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ جس دن اس شیطانی حکم کی زد پہلی بار غیر یہودی حلقوں پر پڑی تو یہ مالک بن اجلان کی بہن کی شادی کا دن تھا۔ عین بارات کے دن وہ بھائی کے سامنے سے سخت بے حجابانہ ہیئت کے ساتھ گزری۔ مالک نے ملامت کی تو بہن نے کہا کہ کل جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ اس سے شدید تر ہے۔ اس طعنے کی چبھن اتنی سخت تھی کہ مالک نے فطیون کو جا کر قتل کر دیا اور شام کو چلا گیا۔ وہاں غسانی حکمران ابو جُبلہ فرماں روا تھا۔ اس نے جب حالات سُنے تو مدینہ پر حملہ کر کے بڑے بڑے یہودیوں کو قتل کیا اور اوس و خزرج کو خلعت و انعام سے نوازا۔

ان حالات میں یہود اگرچہ کمزور ہو گئے لیکن ان کو اپنی مذہبی سیادت پر فخر و ناز تھا اور وہ تورات رکھتے تھے۔ ان کے اپنے عقیدے تھے، قانون تھے، اخلاق تھے، انہی کے معبدوں اور مذہبی مدرسوں میں جا کر تمام بچے تعلیم پاتے تھے۔ نیز یہود انصار کے سامنے اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ آخری نبی جلد ہی مبعوث ہونے والا ہے، وہ آئے تو پھر ہم اس کے ساتھ ہو کر تمہاری خبر لیں گے۔ یہود کی ان باتوں نے انصار کو بھی پیغمبر

آخرالزماںؐ کا منتظر بنا دیا تھا اور وہ اپنی جگہ یہ سوچتے تھے کہ اگر آنے والا آئے تو وہ یہود سے آگے بڑھ کر اس کا دامن تھام لیں۔ اس طرح مدینہ کا ماحول مدینۃ النبی بننے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

مدینے کا پہلا نوجوان جس نے اپنے آپ کو اسلام کی مشعل برداری کے لیے پیش کیا۔ سُوَیدُ بن صامت تھا۔ یہ ایک ذہین شاعر، ماہر سوار اور بہادر جنگجو تھا۔ ایسے ہی نوجوان انقلابی تحریکوں کے سپاہی بنتے ہیں۔ طائف سے نبی اکرمؐ کی واپسی کے بعد سُوَید بن صامت نے حضورؐ سے ملاقات کی۔ حضورؐ نے دعوت دی۔ سویدؓ پہلے سے صحیفۂ لقمان سے متأثر تھا۔ اس نے کچھ اشعار اور حکمتِ لقمان کے مضامین بیان کیے۔ حضورؐ نے بتایا کہ میرے پاس قرآن ہے۔ پھر قرآن کی آیات سنائیں۔ سوید نے فوراً تسلیم کیا۔ یہ چیز اُس سے بہتر ہے، اور اسلام کا قلادہ گلے میں ڈال لیا۔ یہ نوجوان مدینہ میں واپس پہنچا ہی تھا کہ قتل ہو گیا۔ خدا کی اس پر ہزار در ہزار رحمتیں ہوں۔ کہتے ہیں مرتے دم اَللّٰہُ اَکْبَر اس کے لبوں پر تھا۔

متأثر ہونے والا دوسرا یثربی نوجوان اِیاس بن مُعاذ تھا۔ یہ ایک وفد کے ساتھ مدینہ آیا۔ خدا کے رسولؐ نے ان کے ڈیرے پر پہنچ کر سچائی اور نیکی کا پیغام دیا۔ قرآن سُنایا۔ ایاس نے اپنے لوگوں سے کہا کہ یہ چیز اس سے بہتر ہے جس کے لیے تم آئے ہو۔ وہ آئے تھے قریش سے معاہدہ کرنے، اور حضورؐ محسنِ انسانیت کی بات ماننے کا مطلب معاہدے کے دروازے بند کر دینا تھا۔ پس سردارِ وفد ابوالحَیسَر نے مٹی اُٹھا کر ایاس کے مُنہ پر ماری اور کہا کہ "ہم اس مقصد کے لیے نہیں آئے"۔ ایاس چُپ تو ہو گیا مگر اس کی کشتِ حیات کی مٹی میں دعوتِ اسلامی کے بیج نے جگہ بنا لی۔ افسوس ہے کہ مدینہ کا یہ بیدار دل نوجوان بھی جلد ہی جنگِ بعاث کی لپیٹ میں آ کر دنیا سے رُخصت ہو گیا۔

بہرحال مدینہ میں خدا کے رسولؐ اور خدا کے دین کا تذکرہ پھیل گیا۔

نبوت کے گیارھویں سال حج کے لیے مدینہ سے جو وفد آیا اس کی قیام گاہ عَقَبہ کے مقام پر تھی۔ آنحضورؐ رات کو وہاں پہنچے۔ دعوت دی، قرآن سُنایا، نیکی کی تعلیم دی اور بُرے کاموں سے منع فرمایا۔ اہلِ وفد نے حضورؐ کو اوّلین نظر میں پہچان لیا اور آپس میں کہا

کہ یہ تو وہی نبی ہے جس کا ذکر یہود کرتے رہتے ہیں۔ یہ چھ افراد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل اسلام کے لیے کھول دیے۔ اُنھوں نے ایک تو اس امید کا اظہار کیا کہ ہو سکتا ہے کہ آپؐ کی ذات اور دعوت کے ذریعے خدا ہماری قوم کا تفرقہ دُور کر دے گا۔ نیز آنحضورؐ کی خدمت میں یہ بھی عرض کیا کہ ہم اپنی قوم کے لوگوں کو آپؐ کے دین کی دعوت دیں گے، پھر اگر اللہ تعالیٰ نے انھیں اس دین پر جمع کر دیا تو پھر آپؐ سے زیادہ قوّت رکھنے والا کوئی دوسرا نہ ہوگا۔

یہ مختصر سی جماعت مدینہ لوٹ کر گئی تو ماحول میں ایک نئی حرکت اُنھوں نے پیدا کر دی۔ اسلام کا پیغام پھیلنے لگا اور اسے خوب فروغ حاصل ہوا۔ انصار کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں محمدؐ کا چرچا نہ ہو۔

اگلے سال یعنی نبوت کے بارھویں برس ۱۲ افراد کا وفد مدینہ سے آیا اور عَقَبہ کے مقام پر رسولِ خداؐ کے ہاتھ پر بیعت کی اور چند بڑی پابندیاں قبول کیں۔ یعنی ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ چوری نہیں کریں گے۔ زنا نہیں کریں گے۔ کسی کے خلاف جانتے بوجھتے بہتان نہیں گھڑیں گے۔ اور کسی معروف معاملے میں محمّد صلی اللہ علیہ وسلّم کی نافرمانی نہیں کریں گے۔ یہ پہلی بیعتِ عَقَبہ تھی۔

آج بھی اگر محسنِ انسانیت سے محبّت کرنے والے کم سے کم یہی اقرار باندھیں اور اسے پورا کریں تو ہمارے معاشروں میں تیزی سے اِصلاح پیدا ہو سکتی ہے۔

اس پہلی بیعتِ عُقَبہ کے اختتام پر رسولِ برحقؐ نے مُصعَبؓ بنِ عُمَیر بن ہاشم کو مامور کیا کہ وہ مدینہ میں جا کر دعوت کو پھیلائیں، لوگوں کو قرآن پڑھائیں اور اسلام کی تعلیم دیں۔ حضرت مُصعَب بنِ عُمَیر نے مدینے میں جا کر اسلام کی تعلیم بھی سرگرمی سے پھیلائی اور نمازوں کی امامت بھی کی۔

حضرت مصعبؓ بنِ عمیر نے جس تدبّر و حکمت سے دو سرداروں اُسَید بن حُضَیر اور سَعد بن مُعاذ کو متاثر کیا، اس کی تفصیل میں پڑے بغیر، اُس کا یہ نتیجہ جان لینا چاہیے کہ پورا قبیلہ عبدالاُشہَل چند لمحوں میں اسلام کی تحریکِ فلاحِ انسانیت کا علمبردار بن گیا۔ مردوں اور عورتوں میں سے صرف ایک شخص اُصَیرم الگ رہا۔ جنگِ اُحد کے موقع پر اسلام قبول

کر کے جہاد کیا اور شہادت پائی اور حضورؐ نے اس کے جنتی ہونے کی بشارت دی۔

حج کا زمانہ پھر آگیا اور اب کی بار ۷۲ مردوں اور ۲ عورتوں کی جماعت ادائے حج کے لیے آئی۔ یہ قافلہ عقبہ کے اسی مقام پر ٹھہرا جہاں تین سال سے مدینے کے حجاج قیام کرتے تھے۔

رسولِ اکرمؐ حضرت عباسؓ کو ساتھ لے کر راست بازوں کے اس گروہ سے ملنے آئے۔ جماعتِ مدینہ نے حضورؐ کو اپنے شہر آنے کی دعوت دی اور ہر قسم کی امداد و اعانت کا یقین دلایا۔ حضرت عباسؓ کہنے لگے کہ مکّہ کے لوگ آنحضرتؐ کے جانی دشمن ہیں۔ تم لوگ اگر ان سے کوئی قول و قرار کرتے ہو تو پہلے سوچ لو۔ یہ نازک اور کٹھن کام ہے۔ یہ سرخ و سیاہ قوتوں سے جنگ کا خطرہ مول لینا ہے۔ اس ذمّہ داری کو سوچ سمجھ کر اُٹھاؤ۔ ورنہ بہتر ہے کہ کچھ بھی نہ کرو۔

لوگ خاموش رہے۔ پھر نبی اکرمؐ نے خدا کا کلام پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد اُن لوگوں نے یہ درخواست کی کہ "خدا کے نبیؐ! ہمارے شہر میں چل کر بسیے، تاکہ ہم پوری طرح فیض پائیں۔" حضورؐ نے فرمایا "کیا تم دینِ حق کی اشاعت میں میری پوری پوری مدد کرو گے، میں تمہارے شہر میں جا بسوں تو میری اور میرے ساتھیوں کی حمایت اپنے اہل و عیال کی طرح کرو گے؟" اہلِ وفد نے پوچھا "اس کا کیا صلہ ہمیں ملے گا؟" رسولِ پاکؐ نے جواب دیا "خدا کی خوشنودی، آخرت کی کامیابی اور جنّت!" پھر اہلِ وفد نے عرض کیا "ہم خدا کے رسولؐ کی طرف سے یہ اطمینان چاہتے ہیں کہ حضورؐ کبھی ہم کو نہ چھوڑیں گے۔" حضورؐ نے فرمایا "نہیں نہیں، میرا جینا اور مرنا تمھارے ساتھ ہوگا۔"

بس یہ سُنتے ہی سب لوگ والہانہ جذبے سے رسولِ خدا کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے۔ جب بیعت ہو چکی تو رسولِ برحق نے غلبۂ حق کی اسلامی تحریک کے لیے ۱۲ نقیب مقرر کیے۔ بنو خزرج میں سے ۹ اور بنو اوس میں سے ۳۔ یہ نقیب گویا مدینہ کی اسلامی جماعت کے لیے رسولؐ خدا کی طرف سے نائب تھے، اور اپنی قوم کے تمام معاملات کے ذمّہ دار۔ ان کے تقرر سے منظم معاشرے کی تعمیر کا کام باقاعدہ شروع ہو گیا۔

اب یہ بڑی جماعت مکّہ سے نئی اسپرٹ لے کر مدینے واپس پہنچی تو اسلام کو پھیلانے کا کام تیزی سے ہونے لگا۔ خاص طور سے نوجوان نسل تیزی سے آگے بڑھی اور اس قوّت نے تبدیلی کی رفتار کو تیز کر دیا۔

چند سال سے تحریکِ حق کا آسمانی لیڈر رہا برابر اس سوچ میں تھا کہ زمین کے کسی گوشے میں ہجرت کر کے قوّت کو مجتمع کیا جائے اور پھر جہانِ نو کی تاسیس کی جائے۔ پہلے حَبَشَہ پر نگاہ گئی، مگر حبشہ پناہ گاہ تو بن گیا، نظامِ اسلامی کی تجربہ گاہ نہیں بن سکتا تھا۔ اب مدینہ نے کھلے دل سے دعوتِ حق پہ لبیک کہی تو حضرت مُصعَبؓ بن عُمیر کی دی ہوئی مفصل رپورٹ کی روشنی میں حضورؐ کا دل مدینہ ہی کی طرف مائل ہونے لگا۔ حبشہ سے واپس آنے والوں کو حضورؐ مدینے ہی روانہ کر دیتے۔ بیعتِ عَقَبہ ثانیہ کے بعد تو آپؐ نے اکثر رفقا کو یہی ہدایت دی کہ وہ مدینے چلے جائیں۔

سردارانِ مکّہ اس خطرے کو محسوس کر رہے تھے کہ اگر مدینہ میں تحریک اسلامی کا نیا مرکز بن گیا تو وہ نشوونما پا کر اُن کے لیے چیلنج بن جائے گا۔ نیز اُن کی تجارتی شاہ راہ بجانبِ شام محمدیؐ جماعت کے قبضے میں ہو گی۔ پس مدینہ جانے والے جس مہاجر پر قابو چلتا، وہ اسے روک لیتے، تنگ کرتے اور نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے۔ بعض سے ان کا مال چھین لیتے۔ مگر ہوتے ہوتے مکّے کے کئی گھر ویران اور کئی محلے سنسان ہو گئے۔

تقریر نمبر ۱۱

رسولِ پاکؐ کی ہجرت

دعوتِ محمدیؐ کے علمبرداروں کے لیے مکّے میں ظلم کی بھٹی اپنے آخری درجہ حرارت تک آ پہنچی تھی۔

رسولِ اکرمؐ کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ ہجرت سامنے کھڑی ہے۔ مدینے میں جس تیزی سے دینِ حق کی فصل اُگ رہی تھی، اُس سے بشارت پاکر حضورؐ نے اپنے رفیقوں کو وہاں بھیجنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ سوائے جناب ابوبکر صدیقؓ اور جناب علی مرتضیٰؓ علیہما السلام کے، اور کوئی نمایاں شخصیت مکّے میں باقی نہ رہی تھی۔ کمزور لوگوں کو قریش نے جبراً روک رکھا تھا۔

دینِ حق کی تحریک کے دشمن اس بات سے پریشان تھے کہ محمدؐ کی دعوت کا بیج تناور درخت بن چکا تھا۔ ان کے سامنے سرچشمۂ توحید سے تبدیلی کا ایک طوفانِ نور چلا آ رہا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ اس میں ان کا مذہبی نظامِ شرک اور ان کے مناصب اور جاہلانہ رسوم، سب کچھ بہہ جانے والا ہے۔

ایک دن سردارانِ مکّہ دارالندوہ نامی پبلک ہال میں جمع ہوئے اور سوچا جانے لگا کہ محمدؐ کے خلاف کیا کارروائی کی جائے۔ مختلف تجویزوں پر بحث ہوئی۔ آخر ابوجہل کے دماغ

نے بڑی زور دار اسکیم کے سامنے رکھی۔ اسکیم یہ تھی کہ سارے قبیلوں سے ایک ایک قوی اور معزز نوجوان کو لیا جائے، یہ مسلح ہوں، جونہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سامنے آئیں سب یک بارگی حملہ کر کے اس شخص کو قتل کر دیں۔ اس طرح محمدؐ کا خون قبائل میں تقسیم ہو جائے گا اور اکیلے بنو عبدِ مناف سارے قبیلوں سے ٹکر نہ لے سکیں گے۔ تجویز ایسی شاندار تھی کہ ساری مجلس نے اتفاق کر لیا۔

آنے والی پُراسرار رات آگئی۔ یہ تیرھویں سالِ بعثت کے ماہِ صفر کی ستائیسویں تاریخ تھی، اور جمعہ کی شب!

سازش کی رات حضرت علیؓ کو بلا کر فرمایا کہ مجھے ہجرت کا حکم ہو چکا ہے، آج رات مجھے اپنے مکان پر نہیں سونا ہے۔ میرے بجائے تم سو رہنا۔ صبح اُٹھ کر لوگوں کی امانتیں جو میرے پاس ہیں ان کو واپس کر دینا۔ اخلاق کا یہ معیار دیکھیے کہ حضورؐ کو اپنے قاتلوں کی امانتیں واپس کرنے کا اتنا خیال تھا۔ پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر پہنچے۔ ہجرت کے پروگرام سے آگاہ کیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پہلے سے دو اونٹنیاں اسی ضرورت سے پال رکھی تھیں۔ ایک حضورؐ کی خدمت میں پیش کی۔ مگر آپؐ نے بہ اصرار قیمت طے کر کے اسے خرید لیا۔ جلدی میں اسماء بنتِ ابی بکر نے اپنا کمر پٹکا پھاڑ کر ایک ٹکڑے میں کھانے کا سامان اور دوسرے مشکیزے کا مُنہ باندھا۔

مقررہ گھڑی آپہنچی اور دو مسافرانِ جادۂ حق کا قافلہ رات کی تاریکی میں نکل کھڑا ہوا۔ کیا یہ معجزہ نہیں کہ گلی گلی میں پہرہ لگا تھا، تلواریں تنی ہوئی تھیں، مگر رسولِ خداؐ اور ان کے رفیقِ صدیقؓ نکہتِ گل کی طرح صاف نکل گئے۔

مکّے کو چھوڑتے ہوئے حضورؐ کے جذبات میں جو ہل چل ہوئی وہ ان الفاظ میں ظاہر ہوئی: "خدا کی قسم! تو اللہ کی سب سے بہتر اور محبوب سرزمین ہے، اگر یہاں سے مجھے نکالا نہ جاتا تو میں کبھی نہ نکلتا۔"

تھوڑی ہی دیر میں نبیؐ اور صدیقؓ دونوں غارِ ثور میں تھے۔ اِدھر حضرت علیؓ رسول اللہ کے بستر پر چادر تانے سو رہے تھے۔

قریش نے رات بھر حضورؐ کے مکان کا محاصرہ کیے رکھا۔ پورے شہر کی ناکہ بندی کی گئی تھی۔ آخرِ شب ہیں حضورؐ کے مکان میں گھس کر آواز دی۔ بستر سے حضرت علیؓ اُٹھ کر سامنے آ گئے۔ ان سے کچھ زیادتی کی۔ یہ خبر جب پھیلی کہ محمدؐ تو مکّے سے جا چکے ہیں تو پوری مُشرک پارٹی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ مشورہ کر کے تعاقب کے لیے آدمی چاروں طرف دوڑائے گئے۔ کچھ پتہ نہ چلا۔ تلاش کرنے والے کچھ لوگ غارِ ثور کے دہانے تک پہنچے۔ اندر سے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب ان کے قدموں کو دیکھا تو اس نازک و تاریخی گھڑی میں اُنھیں یہ فکر ہوئی کہ اگر یہ لوگ اندر داخل ہو گئے تو پوری تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل جائے گا۔ حضورؐ کے سامنے خدا کے خاص وعدے اور بشارتیں تھیں، سو اپنے رفیق سے فرمایا: "لاتحزن ان اللہ معنا"، فکر نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے اور پھر خدا کی طرف سے حضرتِ صدیقؓ کے قلب پر سکینت و تسلّی کا نزول ہوا۔ یہ بجائے خود ایک مقامِ سعادت ہے۔ قدرت کا نظامِ تحفظ کچھ ایسا معجزانہ قسم کا تھا کہ دشمنوں نے غار کے دہانے پر پہنچ کر آپس میں کہا کہ اس غار میں کسی آدمی کے داخل ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ وہ لوگ واپس چلے گئے۔

غار میں رہروانِ ہجرت نے تین روز گزارے۔ عبداللہ بن ابی بکر رات کو مکّے کی ساری خبریں پہنچاتے۔ عامر بن فُہیرہ، حضرت صدیقؓ کی بکریوں کا ریوڑ لے کر اس طرف آتا، اور اندھیرا ہو جانے پر دُودھ پہنچا جاتا۔ بکریوں کے گزرنے سے انسانی نقوشِ پا بھی مِٹ جاتے۔ تین روز بعد عبداللہ بن اُرَیقط وقتِ مقررہ پر آ گیا، جسے صحرائی اور پہاڑی راستوں سے آگاہ ہونے کی وجہ سے حضورؐ نے پہلے ہی سے اُجرت پر گائیڈ مقرر کیا تھا۔ حضرت صدیقؓ کا غلام عامر بن فُہیرہ بھی ساتھ ہو گیا، اور قافلہ غارِ ثور سے نکل کر نئی منزلوں کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہ واقعہ تیرھویں سالِ بعثت میں یکم ربیع الاوّل کا ہے۔

اُدھر مکّے میں اعلان کیا گیا کہ محمدؐ اور ابوبکرؓ میں سے جس کو بھی کوئی شخص زندہ یا مقتول حالت میں لائے گا، اُسے ہر ایک کے لیے سَو سَو اونٹ انعام میں دیے جائیں گے۔ بہت سے اور لوگوں کی طرح سُراقہ بن مالک بن جُعشُم نیزہ اُٹھائے سوار ہو کر نکلا۔ اسے خبر ملی کہ ایسے ایسے آدمی ساحل والے راستے پر دیکھے گئے ہیں۔ گھوڑا دوڑاتا آخر وہ قریب

جا پہنچا۔ جب حملے کے لیے جھپٹنا چاہا تو گھوڑے کے اگلے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ دو تین بار کوشش کی۔ مگر ہر بار ایسا ہی ہوا۔ سمجھ گیا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ اُس نے حضورؐ سے معافی چاہی اور امان لکھ دینے کی درخواست کی۔ یہ امان نامہ فتحِ مکّہ کے دن کام آیا۔ سُراقہ نے سواری اور زادِ راہ حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا مگر آپؐ نے قبول نہیں کیا۔ بس یہ فرمایا کہ تم اتنا کرو کہ تعاقب کرنے والوں کو اِدھر آنے سے روکو۔ چنانچہ سُراقہ کو جو کوئی بھی ملا اُسے کہا کہ اِدھر تو میں دیکھ آیا ہوں، کسی اور طرف چلے جاؤ۔

دورانِ سفر میں آپ کا گزر قبیلہ خزاعہ کی اُمِ مَعْبَدْ کے خیمے کے پاس ہوا، حضورؐ نے اُمِ مَعبد سے پوچھا کہ تمھارے پاس کھانے کو کچھ ہے۔ جواب ملا کہ خدا کی قسم! کچھ ہوتا تو آپ کی خدمت میں دل و جان سے پیش کرتی۔ پھر ایک بکری جس کا دُودھ خشک ہو چکا تھا، حضورؐ نے اسکے دوہنے کی اجازت طلب کی۔ برتن منگوایا۔ اتنا دُودھ نکالا کہ آپؐ اور آپؐ کے ساتھی سیر ہو گئے۔ پھر دُودھ نکالا اور بھرا ہوا برتن اُمِ مَعبد کو دیا۔ اُمِ مَعبد کا خاوند مریل اور بیمار بکریوں کو ہنکاتا ہوا گھر پہنچا تو پوچھا کہ یہ دُودھ کہاں سے آیا؟ اُمِ مَعبد نے کہا کہ ایک بابرکت انسان یہاں آیا تھا اور یہ اس کی مبارک آمد کا نتیجہ ہے۔ خاوند بولا کہ یہ تو وہی شخص ہو گا جسے قریش تلاش کر رہے ہیں۔ تم ذرا اُس کا حُلیہ تو بتاؤ۔ اس کے جواب میں اُمِ مَعبد نے ایسے شاندار الفاظ اور فصیح انداز میں رسولِ خدا کا نقشہ بیان کیا ہے کہ اس پر شاعری کی صدہا بیاضیں اور ادب کے ہزاروں دفتر قربان۔

راستے میں حضرت زبیرؓ شام کے تجارتی سفر سے واپس آتے ہوئے ملے، اُنھوں نے رسولِ خداؐ اور حضرت ابوبکرؓ دونوں کی خدمت میں سفید ملبوسات کا ہدیہ پیش کیا۔

پھر بُریدہ اسلمی اپنے ستر ہمراہیوں کے ساتھ سامنے آئے۔ نکلے تو یہ بھی انعام کے لالچ میں تھے، مگر جب سامنا ہوا تو دل کی کیفیت بدل گئی۔ حضورؐ سے سوال کئے، کلام سُنا اور اپنے ستر ساتھیوں سمیت مسلمان ہو گئے۔ سچ ہے "شکار کرنے کو آئے شکار ہو کے چلے!"

بُریدہ نے حضورؐ کے سامنے اپنا یہ شوق ظاہر کیا کہ آپؐ کے آگے آگے ایک جھنڈا

ہونا چاہیے۔ حضورؐ نے اپنا عمامہ نیزے پر باندھ کر بُریدہ کو دے دیا۔ وہ جھنڈا لہراتا آگے آگے چلتا، نعرۂ تکبیر بلند کرتا اور اعلان کرتا کہ "امن کا بادشاہ، صلح کا حامی، اور دنیا کو عدل وانصاف سے بھر دینے والا آ رہا ہے۔"

مکّے سے رسولِ برحق کی روانگی کی خبر مدینے میں پہنچ چکی تھی۔ لوگ ہر روز صبح کو گھروں سے نکل کر دُور تک آتے اور دیر تک راستہ دیکھتے، دھوپ بڑھتی تو واپس چلے جاتے۔

تشریف آوری کے دن بھی لوگ انتظار کر کے لوٹ رہے تھے کہ ایک یہودی نے قلعے پر سے دیکھ لیا اور پکارا۔ "یثرب والو! تو جس بزرگ کا انتظار تھا وہ آ پہنچے۔"

یہ ربیع الاوّل کی آٹھویں تاریخ تھی۔ انصار مارے خوشی کے ہتھیار سج سج کر آئے۔ اللہ اکبر کی صدائیں گونج اٹھیں۔ حضورؐ نے کچھ دنوں کے لیے مدینے کی مضافاتی بستی قُبا میں قیام فرمایا۔ سردار کلثوم بن ہدم کو شرفِ میزبانی حاصل ہوا۔ حضرت علیؓ بھی امانتیں ادا کر کے قُبا ہی میں حضورؐ سے آ ملے۔ مہاجرین وانصار گروہ در گروہ شرفِ ملاقات حاصل کرتے رہے۔ حضورؐ نے یہاں اوّلین مسجد کی بنیاد رکھی، اس کی تعمیر کے لیے پتھر گارا ڈھونے کے کام میں خود حصّہ لیا۔ یہیں آپؐ نے پہلی نماز جمعہ ادا فرمائی اور بڑا موثر تفصیلی خطبہ دیا۔

قُبا میں چودہ[۱۴] دن گزار کر نمازِ جمعہ کے بعد آپ مدینہ کے لیے روانہ ہوئے۔ قُبا سے مدینہ تک دورویہ انصار صفیں باندھے کھڑے تھے۔ حضورؐ کے ننھیالی رشتہ داروں نے شوق سے ہتھیار لگائے۔ ہر طرف تحمید وتقدیس کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، عورتیں چھتوں پر جمع تھیں، اور یہ ترانۂ خیرِ مقدم ان کے لبوں پر تھا ؎

طلع البدر علینا　　من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا　　ما دعی للہ داع

اور چھوٹی بچیاں گھوم کر دف بجا کر الاپ رہی تھیں:

نحن جوارٍ من بنی نجار　　یا حبذا محمدًا من جار

مدینے کا ہر مسلم ناقۂ نبویؐ کی مہار پکڑ کر آپؐ کو اپنے ہاں لے جانا چاہتا تھا۔

حضورؐ نے فرمایا! "ناقہ کو چھوڑ دو، یہ خدا کی طرف سے مامور ہے"۔ ناقہ خود بخود حضرت ایوب انصاریؓ کے گھر کے سامنے بیٹھ گئی اور میزبانی کا شرف اُنھی کا مقدر ہوا۔

آج گویا تحریکِ عدل و رحمت کا نیا باب شروع ہوا۔ ایک تازہ دورِ کشمکش کا افتتاح۔ اور اس کے ساتھ زمانۂ عروج کا آغاز!

تقریر ۱۲

مدینہ میں تعمیری کام

جن شخصیتوں اور جماعتوں کے سامنے کوئی عظیم مقصد ہوتا ہے، وہ جب اس کے لیے ہجرت کرتی ہیں تو پھر وہ نئے مقام پر پہنچ کر کھانے کمانے پر نہیں ٹوٹ پڑتیں، بلکہ ساری فکر اصل مقصد کے لیے راستہ بنانے کی ہوتی ہے۔ خدا کی راہ کا سچا مہاجر وہ ہوتا ہے جس نے خدا کی نافرمانی سے بچنے کے لیے وطن چھوڑا ہو، اور خدا کے دین کو غالب کرنے کی آزادی حاصل کرنے کے لیے دوسری جگہ قدم رکھا ہو۔

مدینہ آتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور تحریکِ اسلامی کے فدا کاروں کی ساری توجّہ اس بات پر تھی کہ نظامِ حق کی سربلندی کے انتظامات کیے جائیں۔ چنانچہ رسولِ عدل و رحمت نے پہلے ہی سالِ ہجری میں ابتدائی ضروری کام انجام دے لیے یا کم سے کم زیادہ وسیع اور بھاری امور کے لیے اتنا ابتدائی کام کر لیا کہ ۲ ہجری میں ان کی بھی تکمیل ہو گئی۔

سب سے پہلا تعمیری کام جو جماعتِ محمدیؐ اور اس کے جلیل القدر سربراہ نے انجام دیا وہ یہ تھا کہ اقامتِ صلوٰۃ کا نظام چلانے کے لیے فوری طور پر مسجد کی بنیاد رکھ

دی۔ یہی مسجد آگے چل کر قصرِ سیاست بھی بنی، مشورہ گاہ بھی، ایوانِ عدالت بھی، مدرسہ بھی، خزانہ بھی اور مہمان خانہ بھی۔

حضورؐ کی اونٹنی جہاں آکے بیٹھی تھی وہ زمین بنو نجار کے دو یتیم بچّوں کی تھی۔ یہ زمین آپؐ نے خریدنا چاہی۔ مگر مالک یتیموں نے قیمت لینے سے انکار کر دیا۔ تعمیرِ مسجد کی مہم شروع ہوئی۔ قُبا کی طرح یہاں بھی جملہ مسلمانوں کے ساتھ ان کا عظیم المرتبہ لیڈر بھی مزدور بنا پتھر اور گارا ڈھو رہا تھا۔

مسجد بن جانے کے بعد سوال اُٹھا کہ دُور تک پھیلے ہوئے لوگوں کو نماز کے لیے بُلایا کس طرح جائے۔ مختلف تجویزیں بیان ہوئیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنا ایک خواب بیان کیا کہ میں نے ایک شخص کو یہ یہ کلمات پُکارتے سُنا۔ ایسا ہی خواب حضرت عبداللہ بن زید نے بھی بیان کیا۔ حضورؐ نے ان کلمات کو اور پُکارنے کے اِس طریقے کو پسند فرمایا۔ حضرت بلالؓ کو موذن مامور کیا گیا۔ وہ بڑی والہانہ کیفیت سے اذان کہتے۔ مسجد کے ساتھ گارے اور پھونس کے حجرے یا کوارٹر حضورؐ کے اہلِ خانہ کیلئے تعمیر ہو گئے۔

تعمیرِ مسجد کے وقت حضورؐ کی عمر ۵۳ سال، ایک ماہ کے قریب تھی۔ یہ پہلے سال ہجری کا ماہ ربیع الاوّل تھا۔

جن لوگوں کو ایمان کے تقاضے کے تحت بڑے اور مبارک کام کرنے ہوتے ہیں وہ انتہائی مشکل حالات میں بھی ان کو جلد از جلد انجام دیتے ہیں۔ نہ کوئی ٹال مٹول ہوتی ہے، نہ ہیر پھیر، نہ حیلہ حوالہ۔ تعمیرِ مسجد کے ساتھ ہی آپؐ نے خطبات و مواعظ کا سلسلہ شروع کر دیا، تاکہ اسلام کا عِلم پھیلے اور ذہنوں اور کرداروں کی نئی تشکیل ساتھ کے ساتھ ہوتی جائے۔ اسی مسجد میں وہ اقامتی درس گاہ بھی قائم ہوئی جس کے طلبہ کو اصحابِ صفہ کہتے ہیں۔ صفہ ایک چبوترا تھا جس پر علمِ دین سیکھنے والے مجرد نوجوان دن کو پڑھتے اور رات کو وہیں سو جاتے۔ ان کی کفالت مدینے کے لوگ کرتے۔

ایک علاقے سے اُکھڑ کر اور اُجڑ پجڑ کر آنے والوں کی نو آبادکاری کسی دوسرے مقام پر بڑا مشکل کام ہوتی ہے۔ انسانی تعلقات خراب ہو جاتے ہیں، لوگوں سے شائستگی

رخصت ہو جاتی ہے، اخلاق کی قدریں تباہ ہونے لگتی ہیں، کیونکہ مقامی اور مہاجر لوگوں میں مال و جائیداد میں کھینچا تانی شروع ہو جاتی ہے ـــــ اور مدینے کا حال تو یہ تھا کہ وہ آج کل کے بڑے شہروں جیسا بڑا شہر بھی نہ تھا۔ ایک عام سا قصبہ تھا جس کی چند ہزار کی آبادی متعدد بستیوں میں بٹی ہوئی تھی۔ وہاں کوئی وسیع ذرائع و وسائل نہ تھے۔ بعد میں اس آبادی پر پندرہ، بیس فیصد مہاجرین کا بار آپڑا۔ مگر وہاں ایسا نہیں ہوا کہ انصار اپنے اموال اور املاک کو روک کر بیٹھ رہیں اور آنے والوں کو ترسا ترسا کر ان سے اشیائے ضرورت کی بھاری قیمتیں وصول کریں، یا مہاجرین شور مچا مچا کر چھینا جھپٹی کرنے لگیں۔ ایک دوسرے کے خلاف بیان بازی ہو اور جلوس نکلنے لگیں اور ان میں ٹکراؤ ہونے لگیں۔ یہاں تو دونوں فریق اپنے عقیدے اور مقصد کی بنا پر بھائی بھائی تھے۔ وہ تو دنیا میں بدی کے خلاف جنگ لڑنے والا ایک جان لشکر بن کے اٹھے تھے۔ ایک فریق میزبان بنا، اور دوسرے کو مہمان بنا کر ساتھ رکھا۔ نہ اُنھوں نے تنگی دکھائی، نہ اِنھوں نے گھبراہٹ!

پھر بھی ایک مستقل اور واضح تنظیم اخوت کی ضرورت تھی۔ فلاحِ انسانیت کے علمبردار جناب محمد مصطفیٰ ﷺ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ بن مالک کے گھر میں انصار و مہاجرین کی ایک مجلس منعقد کی۔ حاضرین کی تعداد نوّے تھی۔ حضور ﷺ نے ایک ایک انصاری اور ایک ایک مہاجر کے درمیان رشتۂ اخوّت استوار کیا۔ اس طرح گویا ہر فرد کے ذمّے ایک ڈیوٹی لگا دی۔ انصار نے اپنی زمینوں، باغوں، مکانوں اور مال و زر میں سے نصف نصف حصّہ مہاجر بھائیوں کو پیش کر دیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے سامنے ان کے مواخاتی بھائی حضرت سعد بن ربیع انصاری نے تو یہاں تک پیش کش کی کہ میں اپنی دو بیویوں میں سے ایک کو طلاق دے کر تمھارے حوالے کرتا ہوں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ انصار کی وراثت سے بھی مہاجرین حصّہ پانے لگے۔ مگر ایسے مہاجر بھی تھے جو انصار سے کہتے کہ تمھارے اموال تمھیں مبارک، ہمیں بازار کا راستہ دکھا دو، ہم محنت کر کے روزی کما لیں گے۔

کسی فریق نے یا کسی فرد نے اس معاملے میں نہ تو کوئی جھگڑا کیا، نہ تُرش روی سے

بات کی، نہ کسی طرح کے شک کا اظہار کیا، اور نہ قبیلوی اور علاقائی عصبیت کے تحت یہ سوچا کہ یہ لوگ جو "سَن آف دی سوائل" نہیں ہیں، انھیں کیا حق ہے کہ ہمارے دائرۂ رزق سے معاش حاصل کریں۔

پوری تاریخ انسانی میں کوئی نظریہ یا تحریک ـــــ خصوصاً دورِ حاضر میں ــــ مہاجرین کی آبادکاری کی ایسی کوئی مثال پیش نہیں کر سکتی، جیسی پیغمبر آخرالزّماں اور حضورؐ کے پیروؤں نے پیش فرمائی ہے۔ آپؐ کا اصل اعجاز یہ ہے کہ آپؐ نے ایسے انسان تیار کر دیے جن کی نگاہ میں خدا اور رسولؐ اور دین کے مقابلے میں ہر چیز بے وقعت تھی۔ نہ وطنیت، نہ علاقہ، نہ نسل، نہ خاندان اور نہ مال و زر۔ حقیقی اسلام وہی ہے جو اِن تمام تبانِ خاک و خون اور اصنامِ سیم و زر سے آدمی کو یا لاتعر کر دے۔ کسی ملک یا علاقے کا متفق علیہ دستور بنانا اور اسے معاشرے کے سارے اہم طبقوں کی رضامندی سے نافذ کرنا کتنا مشکل کام نظر آتا ہے۔ اس دورِ روشن میں بھی بعض قوموں نے دستور کے معاملے میں سالہا سال غارت کر دیے۔

لیکن کمال ہے حضورؐ کی سیاسی دانش و بصیرت اور گفت و شنید کی مہارت و حکمت کا، کہ پہلے ہی سالِ ہجری میں رسولِ خدا نے یہودیوں کے تین بڑے قبیلوں، انصار کے دو بڑے قبیلوں اور مہاجرین کی جماعت کو ایک دستوری معاہدے پر متفق کر لیا۔ حیرت انگیز تدبّر ہے کہ مخالفانہ رجحانات کے موجود ہونے کے باوجود مسلم اقلیّت کے سربراہ نے غیر مسلم اکثریّت سے ایک ایسی دستاویز منوائی، جس کا ماحصل یہ تھا کہ:

اولاً۔ مدینہ میں جو نیا معاشرہ حضورؐ منظم کر رہے تھے اس کے لیے خدا کی حاکمیت اور شریعت کے قانون کو اساس کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

ثانیاً: سیاسی، قانونی اور عدالتی لحاظ سے آخری اختیارات محمّد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ آ گئے۔

ثالثاً: دفاعی لحاظ سے مدینہ اور اس کے نواح کی پوری آبادی ایک متحدہ طاقت بن گئی، اور اس کے کسی بھی عنصر کے لیے قریش کی حمایت کرنے کے دروازے بند ہو گئے۔ نیز دفاعی لحاظ سے بھی فیصلہ کن مقام رسولِ خدا ہی کے لیے طے کیا گیا۔

مدینے کا یہ دستوری معاہدہ درحقیقت مدینے کی اسلامی ریاست کے قیام کی واضح دستاویز تھا۔

اندازہ کیجیے کہ جن اولوالعزم کارپردازوں کو کوئی بڑا کام کرنا ہوتا ہے کہ وہ کس طرح مشکل ترین حالات کے اندر سے راستہ بنا کر اپنا مقصد حاصل کر لیتے ہیں، اور جو نہیں کر سکتے وہ برسوں ٹامک ٹوئیے مارتے رہتے ہیں۔ ∞

تقریر ۱۳

دفاعی تیاریاں اور عسکری تربیت

مدینے پہنچ کر محسنِ انسانیت محمد مصطفیٰ ؐ نے اقامت صلوٰۃ، تنظیم مواخات اور دستوری معاہدے سے بھی بڑا ایک اور کارنامہ انجام دیا۔ وہ تھا مدینے کے دفاعی نظام کا قیام، اور مسلمانوں کی عسکری تربیت!

حقیقت یہ ہے کہ بہت سے وجوہ سے حضور ؐ محسنِ انسانیت اور آپ کی مسلم جماعت کے لیے جنگی کارروائی کا راستہ کوئی پسندیدہ راستہ نہ تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ مسلم جماعت کی ضرورتوں کا لحاظ کر کے مخالفانہ حالات کی رَو تھمی نہ رہ سکتی تھی اور حضور ؐ کسی ایسے محدود مذہب کے داعی بھی نہ تھے جو ایک گال پر تھپڑ کھانے والے کو چپکے سے دوسرا گال آگے کر دینے کی تعلیم دیتا ہو۔ یہاں تو اسکیم انقلاب کی تھی، اور انقلاب کا ایک مرحلہ اگر ہجرت ہوتا ہے تو اس سے آگے جہاد کا دوسرا مرحلہ بھی آتا ہے۔ خدا پرستانہ بنیادوں پر ایک جہانِ نو تعمیر کرنے کے لیے جو اُمت وَسط اُٹھی تھی اسے معلوم تھا کہ جس قوت نے اُنھیں ۱۳ سال تک تشدد کی چکی میں پیسا ہے اور جس نے اُنھیں گھروں سے نکالا ہے، اس کے ارادۂ جنگ کی تلوار بھی سروں پر لٹک رہی ہے۔

دراصل کلمۂ طیّبہ پڑھنے والے پہلے دن ہی سے سمجھتے تھے کہ اس کلمے میں جہاد کے بیج موجود ہیں۔ یہ دلدادگانِ حق اپنی دوہری ڈیوٹی کو خوب سمجھتے تھے کہ ایک قدم جانماز پر ہو تو دوسرا شہادت گہ الفت میں! مگر دفاعی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے شعور و جذبہ ہی کافی نہیں ہوتا۔ تنظیم اور تربیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ خدا کے مقرر کردہ مربّی و مزکّی نے بڑے ٹیڑھے حالات میں جماعت کو جس حُسن و خوبی سے دفاع کیلئے بہت تیزی سے تیار کیا وہ شہادت ہے اس بات کی کہ خدا نے حضورؐ کو بہترین کمانڈر اور سپہ سالار بھی بنایا۔

مدینہ کے اِرد گرد تین طرف یا تو پہاڑیاں تھیں، یا گنجان بستیاں اور باغات، یا لاوے کے سخت پتھریلے میدان۔ یوں گویا قدرتی تحفظات کا ایک قلعہ بنا ہوا تھا۔ صرف شمال کی جانب سے شہر کا راستہ کھلا تھا۔ لیکن مکّے والوں کا جنوب کی طرف سے آکر شمالی کی طرف سے حملہ کرنا، اپنے لیے پیچیدگیاں رکھتا تھا۔ اذنِ الٰہی سے حضورؐ نے ایک اقدام یہ کیا کہ مدینے کو بھی مکّے کی طرح حرم (HOLY CITY OF PEACE) قرار دے دیا، اور اس کا اعلان کر دیا گیا۔ اس میں یہ بات بھی مضمر تھی کہ دشمن اگر حرمِ مدینہ کے تقدس و احترام کو ملحوظ نہ رکھے گا تو خود وہ بھی حرمِ مکّہ میں محفوظ نہ رہے گا۔

مسلمانوں کی فوجی تربیت کے لیے حضورؐ نے نماز کی صف بندی کی بنیاد پر عسکری صف بندی کی تعلیم دی۔ تیر اندازی اور دوڑوں کے مقابلے کرائے۔ چھوٹے چھوٹے عسکری دستے بنا کر ان کو کمانڈروں کے تحت سرحدی گشت کے لیے بھیجنا شروع کیا۔ مختلف افراد کو رات کے وقت پہرے کی ڈیوٹیاں سونپی گئیں۔ سپاہیوں کے لیے شناختی الفاظ اور اشارات مقرر ہوئے۔ حضورؐ نے اپنے سپاہیوں کو سرحدوں کی طرف بار بار بھیج کر یہ چاہا کہ ایک تو دشمن کی نقل و حرکت کا حال معلوم ہوتا ہے، دوسرے سپاہی ارد گرد کے علاقوں کے نشیب و فراز کو جنگی نقطۂ نظر سے جان سمجھ لیں، تیسرے چوطرفہ آبادیوں کو یہ شعور ہو جائے کہ اب یہاں ایک منظم ریاست بھی موجود ہے۔

معرکۂ بدر سے پہلے سرحدی گشت اور دیدبانی کے لیے سات آٹھ نمایاں مہمات روانہ ہوئیں۔ پہلے سالِ ہجرت کے رمضان میں امیر حمزہ بن عبدالمطلب کی سرکردگی میں

۳۰ آدمیوں کا دستہ سیف البحر کی جانب روانہ کیا گیا۔ ابو جہل تین سو آدمیوں کو ساتھ لے کر مکّے سے آیا تھا۔ لیکن مسلمانوں کو چوکنّا پاکر واپس چلا گیا۔ شوال میں ۶۰ آدمیوں پر مشتمل ایک جیش عبیدہ بن حارث کی کمان میں اہلِ مکّہ کے فوجی حالات معلوم کرنے کو بھیجا گیا۔ دشمن کے دو سو آدمی ثنیۃ المُرۃ کے مقام پر دیکھے گئے۔ ان کی رپورٹ اس دستے نے مدینے پہنچائی۔ ذی قعدہ میں سعد بن ابی وقاص کی سرکردگی میں اسّی سپاہیوں کا جیش جُحفہ تک بھیجا گیا۔ ہجرت کے دوسرے سال ماہِ صفر میں حضورؐ بہ نفسِ نفیس اپنے ساتھ ستّر افراد کو لے کر اَبْوا کے علاقے میں تشریف لے گئے جہاں سے قریش کی شاہ راہِ تجارت گزرتی تھی۔ اسی سفر میں آپ نے مُخشی بن عمرو جعفری سے معاہدہ کیا پھر آپؐ ربیع الاوّل میں دو سو سپاہیوں کا دستہ ساتھ لے کر بُواط کی جانب تشریف لے گئے جو یَنبُوع کے قریب ہے۔ راستے میں اُمیّہ بن خلف کی سرکردگی میں سو افراد پر مشتمل ایک قافلہ سامنے آیا۔ دونوں طرف سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ ربیع الاوّل ہی میں کرز بن جابر فہری نے مدینے کے مویشیوں پر ڈاکہ ڈالا۔ اطلاع ملتے ہی حضورؐ نے ۷۰ جانبازوں کو ساتھ لے کر تعاقب کیا، مگر دشمن بچ کر نکل گیا۔ پھر جمادی الاُخریٰ میں رسولِؐ برحق ڈیڑھ سو مجاہدین کا جیش ساتھ لے کر ذُوالعُشَیرہ تشریف لے گئے۔ یہاں بنی مُدلج اور بنی زُہرہ سے معاہدہ کیا۔

ماہِ رجب میں عبداللہ بن جحش کی کمان میں ۱۲ مجاہدین کی ایک مہم مقام نخلہ کو روانہ ہوئی۔ قریش کے ایک چھوٹے سے قافلے سے جھڑپ ہو گئی۔ دشمن کا ایک آدمی مارا گیا، دو قیدی بنائے گئے، ایک بھاگ گیا اور مجاہدین مالِ غنیمت بھی ساتھ لے آئے۔ مدینے پہنچے تو حضورؐ نے سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا، کیونکہ ابھی تک حضورؐ کی طرف سے تصادم کرنے کی اجازت نہیں جاری ہوئی تھی۔ آپؐ نے قیدی رہا کر دیے، مقتول کا خون بہا اور مالِ غنیمت قریش کو روانہ کر دیا۔ واقعۂ نخلہ نے مکّے والوں میں اشتعال پیدا کر دیا۔

ان تیاریوں کے ساتھ حضورؐ نے مدینہ کے گرد و نواح کے متعدد قبائل سے رابطہ کر کے ان کو حلیف بنا لیا۔ ان قبائل میں بنی حمزہ، جُہینہ، بنو ضمرہ، بنو زُرعہ، بنو ربعہ اور

بنو مُدرلج اور بنو زہرہ وغیرہ شامل تھے۔ بعض قبائل کے ساتھ مشترکہ دفاع کا معاہدہ ہوا، بعض نے صرف اتنی بات قبول کی کہ مسلمانوں کے دشمنوں سے دوستانہ تعلقات نہیں رکھے جائیں گے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا، معاہدۂ مدینہ کی بھی دفاعی اہمیت ہے۔ اس میں جملہ شرکا سے منوایا گیا تھا کہ عربی قبائل میں جو مُشرک اور یہودی شامل ہوں، وہ مسلمانوں کے تابع اور جنگ کی صورت میں اُن کے معاون ہوں گے۔ نیز وہ قریشِ مکّہ کے جان و مال کو امان نہیں دیں گے، اور نہ اُن کے خلاف مسلمانوں کی طرف سے جنگ ہونے پر کوئی رکاوٹ ڈالیں گے۔ یہودیوں کے ساتھ یہ اصولی بات بھی قرار پا گئی کہ جنگ و صلح کے معاملات تمام اہلِ مدینہ میں مشترک ہوں گے اور یہودی ہر اس قوّت سے لڑیں گے جس سے مسلمان لڑیں، اور ہر اس قوّت سے صلح کریں گے جس سے مسلمان صلح کریں۔ معاہدۂ مدینہ کی یہ شرائط گواہ ہیں کہ دفاعی لحاظ سے آنحضورؐ کی نگاہِ بصیرت کتنی دور رس تھی، نیز یہودیوں سے تو آپؐ نے ایسی باتوں پر انگوٹھا لگوا لیا جن پر بعد میں وہ لوگ کفِ افسوس ملتے ہوں گے۔

دفاعی تیاریوں کا ایک پہلو یہ تھا کہ مسلمانوں میں انفاق فی سبیل اللہ کی ایسی رو دوڑا دی گئی کہ ہر کوئی خدا و رسول کے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تھا، اور خوش حال لوگ دل کھول کر اہلِ حاجت پر خرچ کرتے تھے۔

اب آخر میں یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ حضورؐ کی دفاعی تیاریوں میں یہ بات بھی شامل تھی کہ اپنے ہم مقصد رفیقوں کو جنگی اخلاق کی بھی تربیت دیں۔ ڈسپلن کی اہمیت محض تنظیمی لحاظ سے بھی بہت ہے، مگر اسلام میں یہ اخلاقی لحاظ سے بھی بڑا فریضہ ہے۔ ڈسپلن کی بعض خلاف ورزیاں پورے کیے کرائے کو غارت کر دیتی ہیں۔ پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ نخلہ کی مہم میں عبداللہ بن جحشؓ نے قریشی قافلے پر جو چھاپہ مارا تھا، اسے حضورؐ نے اس بنا پر ناپسند فرمایا کہ مرکزی کمان (سنٹرل کمانڈ یا ہیڈ کوارٹر) سے ابھی تک حملہ آور ہونے کا حکم جاری نہیں ہوا تھا۔ محسنؐ انسانیت کی سربراہی میں چلنے والی ریاست کے اندر ہر مسلمان کو اپنے عقیدے، مشن، اطاعتِ خدا کی آزادی، اور ظلم کی سرکوبی کے لیے سپاہی قرار دیا گیا۔ یعنی یہ ایمان والوں کی

دینی و اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی ریاست کے تحفظ اور تحریکِ اسلامی کے راستے کی رکاوٹیں دُور کرنے کے لیے بوقتِ ضرورت میدانِ جہاد میں اُتریں۔ فوج کو بار بار ذہن نشین کرایا گیا کہ دُشمن کے مقابلے پر آنے کے بعد فرار بہت بڑا جُرم ہے (صرف جنگ جاری رکھتے ہوئے جنگی ضرورت کے تحت کمانڈر کے حکم سے آگے، پیچھے یا دائیں بائیں ہٹا جا سکتا ہے) اس معاملے میں حضورؐ حق کے سپاہیوں سے بیعت بھی لیتے تھے۔ پھر حضورؐ کا یہ نمونۂ عمل ساری اُمت کے لیے ذریعۂ تربیت ہے کہ جہاد پر نکلنے سے پہلے بھی اہم رفیقوں سے مشورہ کرتے۔ پھر فوج کے لیے کیمپ متعین کرنے اور میدانِ جنگ میں اس کی ترتیب مقرر کرنے کے لیے بھی آراء لیتے۔ میدانِ جنگ میں صف بندی کراتے اور امیر کے حکم سے پہلے تیر پھینکنے یا قدم بڑھانے یا نیزے کو سامنے کی طرف تان لینے کو سختی سے منع فرماتے۔

انسانیت کے عظیم محبؐ و محسن نے عورتوں، بچوں، بوڑھوں، معذوروں، جنگ سے بے تعلق افراد اور معبدوں میں پائے جانے والے تارک الدنیا رہبانوں اور مجاوروں کو قتل کرنے سے مجاہدینِ اسلام کو ہمیشہ کے لیے منع فرما دیا۔ اسی طرح یہ بھی حکم دیا کہ اگر کسی شخص کی زبان پر اسلام کا کلمہ آئے تو اسے قتل نہ کیا جائے اور بعد میں اطمینان سے اس کے بارے میں مفصل تحقیقات کر لی جائے۔ اس طرح جس بستی سے اذان کی آواز سنائی دے، ایسی بستی پر حملہ نہ کیا جائے۔ کوئی حریف اگر سرِ اطاعت خم کر دے یا صلح و امان کا طالب ہو تو اس کی جان نہ لی جائے۔ بلکہ جنگ شروع کرنے سے پہلے مسلم فوج کی طرف سے یہ اعلان کیا جانا بھی ہمیشہ کے لیے سُنت بن گیا کہ اگر حریف اطاعت قبول کر لے اور ہتھیار ڈال دے تو اس سے جنگ نہ کی جائے۔ وہ اگر اسلام کو قبول کر لے تو بھی اس پر حملہ نہ کیا جائے گا۔ پس اگر دونوں باتیں منظور نہ ہوں تو پھر تلوار فیصلہ کرے گی۔ حضورؐ نے یہ تعلیم بھی دی کہ اگر دُشمن کے کسی فرد یا گروہ کو مسلمانوں کی طرف سے، ان کا کوئی ادنیٰ فرد بھی پناہ یا امان دے دے تو ایسی پناہ یا امان سارے لشکر کی طرف سے محسوب ہو گی۔ رسولِ صادق و مصدوق نے یہ تلقین بھی فرمائی کہ دشمن کے مقتولین کی لاشوں کی بے حرمتی نہ کی جائے۔ ان کے ناک کان کاٹ کر چہروں کو بگاڑا نہ جائے۔

سوچئے کہ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب کوئی متفقہ واضح بین الاقوامی قانون موجود نہ تھا، کوئی ادارۂ اقوامِ متحدہ قائم نہ تھا، کوئی معاہدۂ جینوا طے نہیں ہوا تھا۔ محسنِ انسانیت ہمارے اس دَور کے سرے پر وہ پہلی قائدانہ شخصیت تھے جنھوں نے میدانِ جنگ تک کے لیے بھی دشمن کے حقوق اور مسلمانوں کے اخلاق معین کیے —— اور آج ایک یہ زمانہ ہے کہ اقوامِ متحدہ کے علاوہ بہت سے ادارے اور معاہدے اور بین الاقوامی قوانین کے مسلّمہ مسودے موجود ہیں، لیکن مہذب کہلانے والی قومیں جب کبھی میدانِ جنگ میں آتی ہیں تو پھر شکست کھانے والی قوت کی نہ جانیں بچتی ہیں، نہ اموال، نہ غیرت و آبرو اور نہ ان کی عورتوں کے ناموس اور پھر اس مہذب دور کی قوموں کے اندر جب کبھی گروہی تصادم ہوتے ہیں یا کوئی انقلابی قوت ابھرتی ہے تو اس وقت جو تذلیل و تباہی انسانیت کی ہوتی ہے اس کا اندازہ کسی کو نہیں۔

افسوس ہے کہ یہ بدنصیب دنیا محمدؐ کے چشمۂ ہدایت تک نہ پہنچ سکی۔

تقریر ۱۴

جہاد کیا اور کیوں؟

دورِ نبوت کے غزوات کا تذکرہ پڑھ کر مستشرقین کے اُٹھائے ہوئے اعتراضات کی بنا پر یہ سوال اکثر اُبھرتا رہا ہے کہ دین کے کام میں تلوار کا کیا کام اور مسجد کے ساتھ میدانِ جنگ کی سرگرمیاں کیوں؟

اسلام میں جہاد کے مقاصد قرآن میں بتا دیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اسلامی ریاست کے وجود و اختیار، اس کے باشندوں اور اس کے املاک کا تحفظ کیا جائے، دوسرا یہ کہ اُس عقیدے، نصب العین، نظامِ حیات اور تہذیبی نقشے کو تباہ ہونے سے بچایا جائے جس کے لیے اسلامی ریاست تشکیل پاتی ہے۔ تیسرا یہ کہ ہر اس تخریبی قوّت کا انسداد کیا جائے جو خدا پرستانہ انقلاب اور انسانیت کی بھلائی کی تحریک کے پھیلاؤ میں مزاحمت کرے، اور چوتھا یہ کہ اگر کسی ظالم قوّت کے ہاتھوں کمزور انسان، بے بس عورتیں اور معصوم بچے مسلسل دُکھ سہ رہے ہوں اور انھیں صلاح و فلاح کا راستہ اختیار کرنے سے روکا جا رہا ہو تو ایسی تخریبی قوّت کا تختہ اُلٹ دیا جائے۔

اس تصوّرِ جہاد کے وسیع دائرے میں دفاعی جنگ بھی آجاتی ہے۔ مگر یاد رہے

کہ تحریکوں اور تہذیبوں کی ہر جنگ ایک پہلو سے دفاعی ہوتی ہے اور دوسرے پہلو سے جارحانہ، بلکہ ساتھ ہی ساتھ وہ اصلاحی و تعمیری بھی ہوتی ہے۔

اس تصورِ جہاد کے تحت حضورؐ محسنِ انسانیتؐ اور آپ کی جماعت کا معاملہ مخالفین کے ساتھ اس طرح تھا، جیسے کوئی ایک بنجر زمین کو تیار کر کے اس میں چمن آراستہ کرنا چاہتا ہو۔ لیکن کچھ جنگلی جانور اوّل تو اس کی تیار کردہ زمین کو بار بار خراب کریں اور پھر جب گل و لالہ نمودار ہو جائیں تو ایک ایک پودے کو نوچ کر کیاریوں کو اجاڑ دینا چاہیں۔ آخر ان جنگلی جانوروں کے ساتھ کس قانون یا اخلاقی شعور کے تحت بے جا مروت برتی جا سکتی ہے۔ عرب میں دو قوتیں آمنے سامنے تھیں۔ ایک طرف باقاعدہ منظم ریاست تھی، اس میں صاف ستھرا شائستہ معاشرہ نشو و نما پا رہا تھا، یہ ریاست ساری دنیا کے لیے ایک پیغام فلاح کی علمبردار تھی۔ دوسری طرف غیر عقلی مشرکانہ عقائد تھے، ہر قبیلے کا الگ ایک دردبست تھا، اخلاقی معیار پست تھا، ایک پرانی ادھ کچری تہذیب تھی جس میں کوئی بہاؤ نہ تھا اور رکھڑا پانی سڑ رہا تھا۔

پس مکے اور مدینے کے درمیان جو جنگی دور گزرا ہے اس کی نوعیت ایک سِول وار کی سی تھی، جسے انقلاب لانے والی قوت کے خلاف پہل کر کے مخالفِ انقلاب قوت نے شروع کیا تھا۔

بدر کی پہلی جنگ کا پس منظر یہ تھا کہ ہجرت کے وقت نبیؐ اکرم کے خلاف سردارانِ قریش نے قتل کی سازش کی اور مکے کی گلیوں میں ہجرت کی رات کو تلواریں تنی ہوئی تھیں۔ بیعتِ عُقبہ کے وقت بیعت کرنے والوں پر یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ حضورؐ کو مدینے لے جانے کے معنی جنگ کے ہیں۔ پھر اہلِ مکہ کا ایک خفیہ خط عبداللہ بن اُبی کو موصول ہوا جس میں مدینے والوں کو دھمکی دی گئی تھی کہ اوّل تو تم از خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی حدود سے نکال دو، ورنہ ہم چڑھائی کریں گے اور تمھیں قتل کر کے تمھاری عورتوں کو سرمایۂ نشاط بنائیں گے۔ پھر ایک پیغام براہِ راست مسلمانوں کو پہنچایا گیا کہ "اس پر مغرور نہ ہو جاؤ کہ تم مکے سے صحیح سلامت نکل گئے، ہم مدینے پہنچ کر تمھاری خبر لیں گے"۔ اسی زمانے میں حضرت سعد بن معاذ

کو ابوجہل نے طوافِ کعبہ سے روکا اور کہا کہ مجھے یہ گوارا نہیں کہ تم لوگ بیت اللہ میں قدم رکھ سکو۔ اور اس کے جواب میں سعد بن معاذ نے کہا کہ تم ہمیں طوافِ کعبہ سے روکو گے، تو ہم تمھاری تجارتی شاہ راہ کو روکیں گے۔

واقعات کی ان ساری کڑیوں کو جوڑ کر دیکھیے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مکّے کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ اوّل روز سے فضا میں لکھا ہوا موجود تھا۔

قریش کو اپنی تلوار کے بے نیام کرنے میں چند وجوہ سے دیر ہوئی۔ ورنہ وہ بہت پہلے قدم اُٹھا چکے ہوتے۔ اُن کے سامنے ایک مسئلہ بنوکنانہ کے تعاون کا تھا۔ جب کہ ان کا علاقہ مکّے اور مدینے کے درمیان حائل تھا۔ بنوکنانہ سے قریش کی دیرینہ مخاصمت تھی۔ اندیشہ یہ تھا کہ وہ قریش کی فوج کو اپنے علاقے سے گزرنے ہی نہ دیں۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ قریشی فوج مدینے پر حملہ آور ہو تو پیچھے سے بنوکنانہ مکّے پر حملہ کر دیں یا کم از کم قریشی فوج کا راستہ مکّے سے کاٹ دیں۔ سُراقہ بن مالک مُدلجی کنانی اس علاقہ کا سردار تھا۔ اسے جب معلوم ہوا تو اُس نے خود مکّے جا کر قریش کو تعاون کا یقین دلایا۔

مکّے والوں کا دوسرا مسئلہ جنگجو سپاہیوں کی فراہمی کا تھا۔ اس کا حل یہ نکلا کہ معاملہ اَحابیش سے طے پا گیا جو زیادہ جنگجو اور تُندخو تھے اور وہ اُجرت پر بھی لڑائیاں لڑتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے مکّے کے قریب الاحابش نامی وادی میں اہلِ مکّہ سے حلیفانہ معاہدہ کیا تھا۔

ایک مسئلہ روپے پیسے کا تھا۔ سو جو تجارتی قافلہ اس سال شام جا رہا تھا۔ اسے مکّے کے لوگوں نے زیادہ سے زیادہ سرمایہ اکٹھا کر کے دیا۔ حتّٰی کہ عورتوں نے اپنے زیورات اور اندوختے لا لا کے پیش کر دیے۔ مدعا یہ تھا کہ اس سرمائے پر جو بھاری منافع ملے، اسے مدینے کے خلاف جنگی کارروائی میں کھپا دیا جائے۔

سوچا جائے تو یہ تجارتی قافلہ تجارتی قافلہ نہ تھا، بلکہ اس کی کمائی ہوئی ہر اشرفی مسلمانوں کا خون بہانے کے لیے برچھی کے پھل اور تلوار کی دھار کی طرح تھی۔ دنیا کی کوئی ریاست آج بھی اپنے حدودِ اثر میں اس قسم کی نقل و حرکت کا کھلا موقع کسی دشمن طاقت کو نہیں دے

سکتی۔ قریش کے تجارتی قافلوں کے خلاف مسلمانوں کی طرف سے جو کارروائی شروع کی گئی تھی، اسے نادان اور متعصب مستشرقین نے لوٹ مار قرار دیا، حالانکہ وہاں مقصود یہ تھا کہ قریش تجارت کے پردے میں جنگ کی تیاری کی مہم جاری نہ رکھ سکیں۔

اس بات کو یہیں چھوڑ کر ہم ایک گزشتہ واقعہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ بیان ہو چکا ہے کہ نخلہ کی طرف جو عسکری دستہ گشت کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ان کا سامنا قریش کے ایک چھوٹے سے تجارتی قافلہ سے ہوا۔ جھڑپ ہو گئی۔ دشمن کا ایک آدمی عمرو ابن الحضرمی مارا گیا۔ ایک شخص بھاگ گیا، دو قیدی بنا لیے گئے۔ کچھ مالِ غنیمت مسلم فوجی دستے کے قبضے میں آیا۔ یہ دستہ جب مدینے واپس پہنچا تو حضورؐ اس کارروائی پر سخت ناراض ہوئے۔ کیونکہ تصادم کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ حضورؐ نے مقتول کا خون بہا، مالِ غنیمت اور قیدی مکّے بھجوا دئے۔ حضورؐ کے اتنا کچھ کرنے کے باوجود مکّے میں اشتعال پھیل گیا۔ اتّفاق یہ کہ مسلم دستے کو علم نہ تھا کہ اسی دن سے ماہِ حرام شروع ہو رہا تھا اور ماہِ حرام میں کسی پر حملہ کرنا پورے عرب کی روایت کے خلاف تھا۔ بس یہ بات مخالفانہ پروپیگنڈے کا ذریعہ بن گئی اور اس واقعہ کو قریش نے جنگی اقدام کرنے کا بہانہ بنا لیا۔

عجب بابرکت صورت تھی کہ وہ پہلا ماہِ صیّام جس کے روزے فرض کیے گئے تھے، اسی میں پہلا معرکہ حق و باطل واقع ہوا اور جیت اہلِ حق کو ہوئی، باطل رفو چکّر ہو گیا۔

اس ماہِ نزولِ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے صبر و تقویٰ کی تربیت کا ذریعہ بنایا جس کے بغیر اسلامی جہاد کا کوئی تصوّر کرنا ممکن نہیں۔ اسی مہینے میں روزے کی حالت میں سپاہیانِ حق نے حضورؐ کے جلو میں پہاڑیوں اور وادیوں کے گشت کیے، روزے رکھ کے ہی جنگ لڑی اور فتح یاب ہوئے۔

تربیت کا یہ مہینہ اہلِ ایمان کیلئے بہت بڑا ٹیسٹ ہے۔ رمضان اس بات کی کسوٹی بن کر آتا ہے کہ کیا دنیا میں نیکی کو غالب کرنے اور باطل کا قلع قمع کرنے والے سپاہی انقلابی فریضہ ادا کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں؟ کیا ان کو نفسانیت پر اتنا کنٹرول ہے کہ وہ اپنی معمولی خواہشات کو اپنے اُوپر حکومت نہ کرنے دیں بلکہ خود ان پر حکومت کریں؟ اگر

یہ بات نہیں تو خوبصورت مقاصد کے بلند بانگ نعرے تو ہر کوئی آسانی سے لگا لیتا ہے، فیصلہ کن معاملہ یہ ہے کہ وہ ان کے لیے قربانیاں دینے اور تکلیفیں اٹھانے کی استعداد رکھتا ہے یا نہیں۔ ماہ رمضان خدائی فوج کے لیے ایسے مجاہد تیار کرنے کا کورس ہے جو بھوک پیاس سہ کر، جھوٹ غیبت سے باز رہ کر اور لطف و آرام کی دیگر بدنی خواہشوں کو زیر کر کے اللہ کی پکار پر لپکتے ہیں۔ ورنہ اگر کوئی شخص کھانے پینے پر چند گھنٹے کی پابندی برداشت نہیں کر سکتا۔ نیند کا کوئی حصہ قربان نہیں کر سکتا، ازدواجی دائرے کی تفریحات سے محض دن کی حد تک اجتناب نہیں کر سکتا تو پھر اگر وہ خدمتِ اسلامی اور اسلامی انقلاب اور اسلامی جہاد کی باتیں کرتا ہے تو ایسی کھوکھلی باتوں سے دنیا مفتوح نہیں ہوا کرتی۔ دنیا ان لوگوں سے مفتوح ہوتی ہے جو دوسروں سے پہلے خود اپنے ساتھ معرکہ آرا ہو کر اپنے آپ کو فتح کر چکے ہوں۔

سو رمضان کی برکتوں کے سائے میں مسلم مجاہدین حضورؐ کے زیر قیادت جہاد کی راہ پر پہلی بار گامزن ہوتے ہیں۔

تقریر ۱۵

پہلا معرکۂ حق و باطل

مدینہ کی اسلامی ریاست کے کارپردازِ اعلیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فوجی تیاریوں کے ساتھ حالات کی نبضوں پر انگلیاں رکھے برابر اندازہ کر رہے تھے کہ کب کیا ہونے والا ہے حضورؐ کا نقطۂ نظر جامد قسم کا نہیں تھا کہ بیٹھے دیکھتے رہیے، جب دشمن حملہ کرے گا تو جواب دینے کی فکر کریں گے۔ بلکہ خالص دفاعی نقطۂ نظر سے بھی اگر سوچا جائے تو بہتر صورت یہی تھی کہ دشمن جونہی جنگ کی تلوار کو سان پر رکھے، اس تلوار کو توڑ دینے کی فکر کی جائے۔ جنگ کو روکنے سے بہتر جنگ کی تیاریوں کو روکنا ہوتا ہے۔

جس لمحے حضورؐ کو قریش کے اُس تجارتی قافلے کی خبر اپنے فوجی دیدبانوں کے ذریعے ملی، جو جنگی کارروائی کا دیباچہ تھا۔ آپؐ نے اس سے تعرض کا فیصلہ کیا۔ میرے نزدیک کوئی وجہ نہیں کہ حضورؐ کے اس اقدام کو مخالفین کوئی غلط معنی پہنائیں، اور نہ کوئی وجہ اس بات کی ہے کہ ہم خواہ مخواہ شرمساری کے ساتھ اس پر معذرت طلب کرتے پھریں۔ دوسری طرف قافلہ کے سردار ابوسفیان نے شام کو جاتے ہوئے بھی مدینے کی فضا کو سونگھنے کی کوشش کی اور آتے ہوئے بھی وہ پھونک پھونک کے قدم رکھ رہا تھا۔ اسے جونہی خطرے کا احساس ہوا،

اُس نے فوجی امداد طلب کرنے کے لیے اپنا قاصد مکے کی طرف دوڑایا۔ قاصد نے مکے جا کر چیخ چیخ کر دہائی دی کہ قریش کے لوگو! اپنے قافلے کو محمدؐ کے ہاتھوں سے بچانے نکلو۔ سخت جذباتی ہیجان میں ایک مضبوط فوج کیل کانٹے سے لیس ہو کر نکل کھڑی ہوئی۔ ابولہب کے سوا تمام اکابر سردار شامل تھے۔ رسولؐ خدا کے نظامِ خبر رسانی سے یہ اطلاع مل گئی۔ اب فیصلہ کن تاریخی لمحہ سامنے تھا۔ اگر قوت کافی ہوتی تو قریشی قافلۂ تجارت اور مکے کی فوج دونوں کو زد میں لیا جاتا۔ لیکن فیصلہ یہی تھا کہ دونوں میں سے کسی ایک ہی کی طرف توجہ کی جا سکتی ہے۔

حضورؐ نے وادیٔ ذفران میں اپنے رفیقوں کا مشاورتی اجلاس منعقد کیا۔ مسئلہ زیرِ بحث یہ تھا کہ اس موقع پر کیا کرنا چاہیے۔ ایک خاصے بڑے گروہ نے قافلے کی طرف اقدام کرنے کی رائے دی۔ حضورؐ نے پھر اپنا سوال دُہرایا۔ حضورؐ کے عندیہ کو سمجھ کر مہاجرین کی طرف سے حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت مقدادؓ بن عمرو نے بھرپور انداز میں اپنا تعاون پیش کیا کہ حکمِ الٰہی کے تحت آپ جدھر بھی اقدام کریں، ہم آپ کے ساتھ ہو کر لڑیں مریں گے، اور بنی اسرائیل کی طرح یہ کہہ کر بیٹھ نہ رہیں گے کہ موسیٰؑ جاؤ تم اور تمہارا خدا مل کر لڑیں۔ حضورؐ نے ایک بار پھر سوال دوہرایا۔ مدعا یہ تھا کہ انصار جن کے ساتھ معاہدۂ عقبہ میں صرف اتنی بات طے تھی کہ مدینے پر حملہ ہونے کی صورت میں وہ بچاؤ کریں گے، اب جبکہ وہ محض قریشی قافلے سے تعرض کے پروگرام پر نکلے تھے، قریشی فوج کے آجانے کی وجہ سے باقاعدہ جنگی کارروائی واجب ہو گئی تھی، حضورؐ جاننا چاہتے تھے کہ اُن کا ردِ عمل کیا ہو گا۔ سعد بن مُعاذ انصار کی طرف سے بولے کہ آپ جو بھی اقدام کریں، ہم آپؐ کے ساتھ سمندر میں بھی کود نے کو تیار ہیں۔

واضح رہے کہ حضورؐ محسنِ انسانیت ۱۲ رمضان ۲ ھ کو مدینے سے نکلے۔ یہ پہلا رمضان تھا جب کہ پورے مہینے کے روزے فرض کیے گئے۔ بروایتِ مشہور مسلم سپاہ کی تعداد ۳۱۳ تھی، بعض محققین کی رائے میں ۳۱۷۔ مقامِ صفرا میں پہنچ کر آپؐ نے ۲ جان نثاروں کو بھیجا کہ وہ قافلے کا پتہ معلوم کر کے آئیں۔ خود وادیٔ ذفران جا پہنچے۔ اطلاع ملی کہ قافلہ بدر کا راستہ چھوڑ کر ساحل کے لیے راستے کی طرف نکل گیا ہے اور خاصا دُور جا چکا ہے۔

قافلے کے بچ کر نکل جانے پر ابوسفیان نے قریشی سردارانِ لشکر کو مشورہ دیا کہ اب سب

کو لوٹ جانا چاہیے۔ بعض سرداروں نے ابوسفیان کی تائید کی۔ مگر ابوجہل کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ اُس نے واقعہ نخلہ کے مقتول حضرمی کے بھائی عَلاَ ابن حضرمی کو بھڑکا دیا جس نے ایک جذباتی طوفان برپا کر دیا۔ آخر قریشی فوج میدانِ بدر کے کنارے آگئی۔

حضورؐ نے رفقا کے مشورے سے فوجی لحاظ سے اپنے کیمپ کے لیے بہترین جگہ کا انتخاب کیا اور جنگی منصوبہ اچھی طرح سوچ لیا۔ دشمن کی تعداد اور اہم افراد کے بارے میں تجسس کرایا۔ پھر رفقا سے فرمایا۔ "مکے نے اپنے جگر پارے تمہارے سامنے لا ڈالے ہیں" یعنی موقع ہے کہ ان قائدینِ شر و فساد کا صفایا کر دو۔ دشمن کی فوج قریباً ایک ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ ان میں ۷ سو زرہ پوش اور ایک سو سوار شامل تھے۔ اونٹوں کا ہجوم ساتھ تھا۔ اسلحہ کی فراوانی تھی۔ رسد بہ افراط تھی۔ سپاہیوں کو خوش کرنے کے لیے شراب کے مٹکے اور گانے والی لونڈیاں ساتھ تھیں۔ دوسری طرف تین سو سے کچھ زائد بے سروسامان خدا پرست تھے۔ اُن کی قوت اُن کے ایمان، اُن کے مشن، اُن کے علم، اُن کے صبر و تقویٰ، ان کے اخلاق اور ان کی تنظیم کی وجہ سے تھی۔ حضورؐ کی مسلم فوج کے سامنے معاملہ محض ایک جنگ جیتنے کا نہ تھا بلکہ تحریک کی پوری بازی مار لینے یا ہار دینے کا تھا۔ ان کا ماضی حال اور مستقبل سب کچھ میدانِ بدر میں سمٹ آیا تھا۔

اور حضورؐ نے گڑگڑا کر بھیگی پلکوں کے ساتھ خدا سے دعا کی کہ "اے اللہ! یہ ہیں قریش! یہ کبر و غرور کے نشے سے سرشار ہو کر اس مقصد سے آئے ہیں کہ تیرے بندوں کو تیری عبادت سے باز رکھیں اور تیرے رسولؐ کو جھٹلائیں۔ پس، اے اللہ تو اپنی نصرت بھیج جس کا تُو نے مجھ سے وعدہ کر رکھا ہے۔" پھر فرمایا کہ "اگر یہ چند جانیں ختم ہو گئیں تو پھر قیامت تک تیری عبادت نہ ہو گی۔" اس رقت بھری دعا کے جواب میں حضورؐ کو قبولیتِ دعا اور فتح کی بشارت دی گئی۔

اگلے دن، یعنی ۱۷ رمضان المبارک کو فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ حضورؐ نے مسلم سپاہ کو صف آرا کیا۔ آغاز مبارزت سے ہوا۔ پھر جو رَن پڑا تو مسلم سپاہ نے ۲۲ جانیں قربان کر کے دشمن کے ستر افراد کو موت کے گھاٹ اتارا، جن میں شیبہ، عتبہ، ابوجہل، عاص ابنِ ہشام

ابیّہ ابنِ خلف اور ابوالبختری جیسے اکابر شامل تھے۔ نیز اپنا کوئی آدمی دیے بغیر دشمن کے ۷۰ ہی افراد کو قیدی بنایا۔ غزوۂ بدر کے چند پہلو بڑے توجّہ طلب ہیں :

غزوۂ بدر ایک واقعاتی شہادت ہے۔ اس بات کی تعداد سپاہ اور اسلحہ کی قوّت میں ایمانی قوّت بہت اضافہ کر دیتی ہے۔ اسی کے ساتھ حق و باطل کا یہ معرکہ اس آیت قرآنی کی تفسیر ہے کہ " وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ "[1] فتح صرف اللہ کی جانب سے ہے۔

یہ واقعہ ایک شمعِ روشن ہے کہ انتہائی نازک لمحۂ جنگ میں جبکہ ظاہری قوّت کی کمی اسلامی محاذ پر عیاں تھی، حضورؐ نے مکّے سے آنے والے دو مسلم نوجوانوں کی خدمت لینے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ راستے میں انھیں دشمن نے حراست میں لے لیا، اور اس وعدے پر چھوڑا کہ وہ رسولِ اللہ کے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔ حضورؐ نے دونوں سے فرمایا کہ تم جو وعدہ کر آئے ہو، لازماً اسے ایفا کرو۔ یہ تھا اخلاقی مقام جس تک انسانیت کو پہنچانا مطلوب تھا۔

خدا کے رسولؐ اور انسانیت کے محسن نے نہ صرف اس کی ممانعت کر دی تھی کہ دشمن کی نعشوں کی بے حرمتی نہ کی جائے، بلکہ ایک بڑا گڑھا کھدوا کر ان کی تدفین کا انتظام بھی کیا۔

مالِ غنیمت کے بارے میں رواج تھا کہ سب لوگ اندھا دھند ٹوٹ پڑتے اور جو کچھ کسی کے ہاتھ لگتا، لے اڑتا۔ اسلامی ضابطۂ جہاد نے اس بدنظمی کو نظم سے بدل دیا۔ سارا مالِ غنیمت حکومت کے زیرِ انتظام چلا گیا۔ میدانِ بدر میں بھی مجاہدین نے ہر شے اپنے سپہ سالار کے قدموں میں رکھ دی۔ پھر حضورؐ نے احکامِ الٰہی کے مطابق اس کو تقسیم کیا۔

اور ایک پہلو یہ قابلِ غور ہے کہ دنیا میں جنگی قیدیوں سے بہت ہی بُرا سلوک کیا جاتا تھا۔ اذیت رسانی بھی اور تذلیل بھی۔ محمدیؐ تحریکِ فلاح نے جنگی قیدیوں کو انسانی شرف سے آراستہ کر دیا۔ مدینے کے مختلف گھروں میں انھیں رکھا گیا اور حضورؐ نے صحابہ کو تاکید کر دی کہ قیدیوں کو اچھا کھلائیں اور پہنائیں۔ اس حکم کی تعمیل میں بعض صحابیوں نے خود

---

[1] الانفال۔۱۰۔ آل عمران ۱۲۶۔

کھجوروں پر گذر بسر کی اور قیدیوں کو اچھے معیار کا کھانا دیا۔ جن اسیروں کے پاس لباس کم تھا۔ ان کو کپڑے دیے گئے۔ مسجد نبویؐ میں جو قیدی رکھے گئے، اُن کے کراہنے کی آواز نے حضورؐ کی نیند غائب کر دی اور آپؐ اس وقت تک نہ سو سکے، جب تک کہ ان کے بندھن ڈھیلے نہ کر دیے گئے۔

قیدیوں کی رہائی کے لیے حضورؐ نے چار چار ہزار درہم فی قیدی فدیہ مقرر کیا، بعض امرا کے لیے زیادہ بھی۔ یہ رقم ڈھائی پونے تین لاکھ درہم بنتی تھی۔ قریش پر اتنا مالی بار پڑنے کے دوسرے معنی ان کی جنگی قوت میں کمی کے تھے۔

نہایت ہی اہم بات یہ ہے کہ خدا پرست تابعین نے اوّلیں معرکے میں اتنی زبردست فتح حاصل کرنے کے باوجود نہ کوئی جشن منایا، نہ ڈھول تاشوں اور بینڈ باجوں کے ساتھ مدینے کی طرف مارچ کیا۔ رسولِ خداؐ کے تیار کردہ مجاہدین کی مسرتیں خدا کے ذکر اور خدا کے شکر میں ڈھل گئی تھیں۔ پھر یہ بھی نہیں ہوا کہ مسلمان زعمِ قوت میں مبتلا ہو جائیں یا یہ سمجھنے لگیں کہ ہم نے مجاہدانہ کردار کا آخری مقام پا لیا ہے۔ بخلاف اس کے قرآن نے اُن پر مؤثر تنقید کر کے بتایا کہ تم میں ابھی کیا کیا کمزوریاں کام کر رہی ہیں اور یہ تنقید برسرِ عام کی جاتی اور ہر طرف پھیل رہی تھی۔

آخری ایمان افروز حقیقت یہ قابلِ توجہ ہے کہ قرآن نے یوم بدر کو یوم فرقان قرار دیا یعنی اس معرکے سے یہ بات نکھر کر سامنے آگئی کہ حق کدھر ہے اور باطل کدھر —— اور کون سی قوت نشو و نما پانے والی ہے اور کسے مٹ جانا ہے۔

تقریر ۱۶

غزوۂ بدر سے غزوۂ اُحد تک

غزوۂ بدر کا بیان ہو چکا، غزوہ اُحد کا باب سامنے ہے۔ ان دونوں بڑے واقعات کے درمیان جو کچھ ہوا اس پر ایک اجمالی نظر ڈال لینی چاہیے۔ مگر اس سے بھی پہلے ہلکی سی جھلک اس مکروہ فضا کی، جو یہود نے پیدا کر رکھی تھی۔ اُس کا بیان اس لیے ضروری ہے کہ آگے کے واقعاتِ سیرت، اور ابوابِ تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

یہود سے بظاہر اُمید تو یہ ہونی چاہیے تھی کہ ایک خدا پرست، پیغمبروں کی نام لیوا، الہامی کتاب کی وارث قوم پیغمبر آخرالزّماں کی تحریک سے تعاون کرے گی۔ مگر یہود نے بڑا گھٹیا مخالفانہ راستہ اختیار کیا۔

قریش کی مخالفت میں استکبار تھا یا احساسِ برتری۔ لیکن یہود کے ہاں حضورؐ کے خلاف حَسَد پایا جاتا تھا جو احساسِ کمتری کی شکل اختیار کرتا ہے۔ مذہبی لوگ جب پستی میں گرتے ہیں تو پھر "پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے"!

اُونچے درجے کے ایک یہودی عالم کی ذہنیت دیکھیے۔ ام المومنین حضرت صفیہ رضؓ بیان کرتی ہیں کہ میں اپنے والد حُییّ ابن اَخطَب اور چچا ابُویاسر بن اخطب کی نگاہ میں

ساری اولاد سے زیادہ چہیتی تھی۔ جب رسولِ خدا مدینے آئے اور قبا میں قیام کیا تو والد اور چچا دونوں ملاقات کے لیے گئے۔ واپس آئے تو اتنے پریشان تھے کہ میرے سلام کرنے پر توجہ نہ کی۔ چچا نے والد سے پوچھا "کیا یہ وہی پیغمبر موعود ہیں" والد نے جواب دیا "ہاں خدا کی قسم!" پھر چچا نے پوچھا کہ "آئندہ کے لیے کیا ارادہ ہے" "خدا کی قسم، جب تک زندہ ہوں دشمنی، اور صرف دشمنی رکھوں گا" کیا شان ہے بے ضمیری کی، جان لیا، پہچان لیا، مگر مان کے نہیں دیا۔

تقریباً یہی ذہنیت یہودی گروہ میں غالب رہی!

حضورؐ کی مجلس میں آتے تو ایسے الفاظ اور انداز سے خطاب کرتے کہ ایک پہلو توہین و تمسخر کا نکلتا۔ اُوٹ پٹانگ سوالات کرتے، مثلاً خدا نے سب کچھ پیدا کیا، آخر خدا کو کس نے پیدا کیا۔ کبھی مطالبہ کرتے کہ اگر آپؐ پیغمبر ہیں تو ہمیں خدا کی ایک جھلک دکھا دیجیے، کبھی کہتے کہ خدا سامنے آکر ہم سے بات کرے۔ انفاق فی سبیل اللہ کی دعوت پر مذاق اڑاتے کہ لو جی (نعوذ باللہ) خدا بھی دیوالیہ ہو گیا ہے کہ لوگوں سے چندے اور قرض مانگتا ہے۔ مسلمانوں کو صدقات دینے سے روکتے کہ کیوں پیسہ برباد کر رہے ہو، یہ تو چار دن کا کھیل ہے۔ مسلمان احکام سُن کر کہتے "سمعنا و اطعنا"، اور یہ ان کی آوازوں میں آواز ملا کر کہتے "سمعنا و عصینا"، اپنے آدمیوں کو کہتے کہ جاؤ تھوڑی دیر کے لیے مسلمان ہو جاؤ پھر واپس آجانا اور کہنا کہ اندر کا حال دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ کچھ لوگوں کو جاسوس بنا کر مجالس میں بھجواتے۔ راتوں کو ساری رپورٹیں لے کر حضورؐ اور آپؐ کی جماعت اور تحریک کے خلاف شاطرانہ چالیں سوچتے۔ یہود کی ایسی حرکات کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ منافقین کا گروہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ منافقین ظاہراً مسلمانوں کی طرح دکھائی دیتے۔ پس جہاں کوئی خاص موقع آتا، رخنہ اندازی کر جاتے۔ کوئی ذمہ داری سامنے آتی تو سٹک جاتے۔

واقعہ نخلہ پر پروپیگنڈا کیا کہ دیکھو جی یہ نئے خدا پرست حرام مہینوں کا احترام بھی نہیں کرتے۔ بعد میں جب حضرت زینبؓ ام المومنین بنیں تو یہ طوفان اٹھا دیا کہ لو جی (نعوذ باللہ) اپنی بہو کے ساتھ شادی کر لی ہے کیونکہ حضرت زیدؓ حضورؐ کے منہ بولے

بیٹے مشہور تھے۔ قرآن نے بعد میں صراحت کی کہ منہ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹے کے مقام پر نہیں رکھا جا سکتا۔ ان بد طینت لوگوں نے ایک موقع پر حضرت عائشہؓ پر بہتان لگا کر ایک بحرانی کیفیت پیدا کر دی۔ غزوۂ اُحد کو جانے والی فوج سے ان کے تین سو آدمی الگ ہو گئے۔

پھر انھوں نے اپنی دولت کے ڈنک فاقہ مست مہاجرین کو لگائے بلکہ خود رسولِ برحق تک کو مالی قوت کے ذریعے اذیتیں دیں۔ ایک طرف ضرورت مند مسلمانوں سے بہت سخت مزدوری لیتے اور حقیر اُجرت دیتے۔ دوسری طرف اُنھیں قرض دے کر پوری مہاجنی شان سے سخت اذیت دیتے۔ یہاں صرف ایک مثال کافی ہو گی۔ ابو حَدْرَدْ اَسلَمی ایک یہودی کے مقروض ہو گئے۔ مقررہ وقت پر تن کے معمولی کپڑوں کے علاوہ ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ اُنھوں نے مہلت طلب کی۔ مہلت نہیں ملی۔ یہودی اس قصے کو حضورؐ تک لایا۔ حضورؐ کے کہنے پر بھی یہودی نے مہلت نہیں دی، بلکہ ابو حدرد کے بدن سے ان کا تہمد اتروا لیا۔ یاد رہے کہ خود حضورؐ کی زرہ مرض الموت کے وقت ایک یہودی کے پاس رہن تھی۔

یہود نے نازک جنگی مواقع پر جو غداریاں کیں وہ اپنی جگہ، بار بار حضورؐ کو قتل کرنے کی ناپاک کوششیں کیں۔ زہر خورانی بھی کی گئی اور جادو کے ٹونے ٹوٹکوں سے بھی کام لیا گیا۔ ایسے دھواں دھار ماحول میں رہتے ہوئے حضورؐ نے غزوۂ بدر سے غزوۂ فتح مکّہ تک کی ساری کارروائیاں بڑی کامیابی سے سرانجام دیں۔

اب ان چند واقعات کا ذکر جو پہلے دو غزوات کے درمیان ہوئے۔

حضورؐ جب بدر سے مدینے واپس پہنچے تو اطلاع ملی کہ بنی سُلیم حملے کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ آپ ۲۵ رمضان المبارک کو ماءُ الکُدر کے مقام پر جا پہنچے۔ تین روز وہاں کیمپ رکھا۔ مگر دشمن کا کوئی نشان نہ ملا۔

ماہِ رمضان کے ختم ہونے میں دو دن باقی تھے کہ صدقۃ الفطر اور نمازِ عید ادا کرنے کا حکم ہوا۔

دوسرے ہجری سال ہی میں زکوٰۃ فرض ہوئی جو نماز کے بعد اسلام کا بہت اہم رکن ہے۔
اسی وقفے میں حضرت علیؓ اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا رشتۂ ازدواج قائم ہوا۔

عین اس وقت جب حضورؐ غزوۂ بدر کے سلسلے میں مدینے سے باہر تھے، یہودیوں کے قبیلے بنی قینقاع نے مدینہ میں فتنہ گری شروع کی، مسلمانوں کو تنگ کرنے لگے، ان کی شرارت پسندی کی حد یہ تھی کہ ایک انصاری مسلم خاتون بازار میں کسی یہودی کی دکان تک گئیں۔ اس یہودی نے خاتون کو سربازار عریاں کر دیا۔ خاتون نے اپنی فریاد بلند کی۔ ایک غیرت مند مسلمان لپکا اور اُس نے بدتمیز یہودی کو قتل کر دیا۔ بعدازاں یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان بلوئی ہو گیا۔

رسولِ برحقؐ واپس تشریف لائے تو آپؐ نے اس فعل پر یہودیوں کو ملامت کی۔ مگر بنی قینقاع نے شرم اور معذرت کا اظہار کرنے کے بجائے کہا کہ ہم قریش نہیں ہیں، جب ہم سے معاملہ پڑے گا تو ہم دکھا دیں گے کہ لڑائی کسے کہتے ہیں۔ گویا بنی قینقاع نے معاہدۂ مدینہ توڑ دیا۔ حضورؐ نے وسطِ شوال میں بنو قینقاع کا محاصرہ کر لیا جو پندرہ دن تک جاری رہا۔ بالآخر بنی قینقاع نے اپنے آپ کو حضورؐ کے حوالے کر دیا کہ جو چاہیں فیصلہ کریں۔ معاملہ ان کی جلا وطنی پر ختم ہوا۔

میدانِ بدر میں قریش کو جو ذلت آمیز شکست ہوئی اس کی وجہ سے گھر گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ ساتھ ہی جذبۂ انتقام زور پکڑ رہا تھا۔ ابوسفیان اب چونکہ سردارِ مکّہ تھا اس لیے اس کی ذمہ داری تھی کہ بدر کے مقتولین کا انتقام لے۔
یہ ۵ ذی الحجہ کو دو سو شتر سواروں کے ساتھ حملے کے لیے بڑھا۔ البتہ مدینے سے تین میل دور عریض نامی بستی پر جا غصہ اتارا۔ ایک مسلمان، یعنی سعد بن عمرو انصاری کو قتل کیا، گھاس کے ذخیرے کو آگ لگائی، چند مکان جلائے اور بھاگ نکلا۔

حضورؐ کو جونہی اطلاع ملی، آپ سپاہیوں کا ایک دستہ ساتھ لے کر تعاقب کو نکل کھڑے ہوئے۔ ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں نے ستّوؤں کے تھیلے راہ میں گرائے تاکہ بھاگنے میں آسانی ہو۔ اسی لیے اس واقعہ کا نام غزوہ سویق ہوا۔

پیغمبر برحق ۹، ذی الحجہ کو غزوۂ سویق سے واپس مدینے تشریف لائے۔ آپؐ نے ۱۰، ذی الحجہ کو ۲، رکعت نمازِ عید الاضحیٰ ادا فرمائی اور دو مینڈھے قربانی دیے۔ نیز مسلمانوں کو بھی قربانی کرنے کا حکم دیا۔ یہ پہلی بقرعید تھی۔

ذی الحجہ کے خاتمے پر مدینہ کی اسلامی ریاست کے سربراہ کو اطلاع ملی کہ بنی ثعلبہ اور بنی محارب نجد میں جمع ہو رہے ہیں، اور اطرافِ مدینہ میں لوٹ مار کا ارادہ رکھتے ہیں حضورؐ نے حضرت عثمانؓ کو مدینہ میں نائب مقرر فرمایا، اور ساڑھے چار سو مجاہدین کے ساتھ نجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس اقدام کی خبر جب دشمن تک پہنچی تو جمع شدہ لوگ پہاڑوں میں منتشر ہو گئے۔ آپؐ نے صفر کا پورا مہینہ گزارا اور ربیع الاوّل میں مدینے واپس آ گئے۔

اسلامی ریاست کا ایک بااثر دشمن کعب بن اشرف یہودی تھا، جو مدینے کی طرف آتا تو یہودیوں کو غداری کی تلقین کرتا، اور مکّہ والوں سے رابطہ ہوتا تو ان کو مسلمانوں کے خلاف اُکساتا، مشکل یہ تھی کہ یہ شخص ہر طرف سے گھوم گھام کر اپنے شاندار محل میں چلا جاتا جو حدودِ مدینہ سے باہر مگر قریب ہی واقع تھا۔ جنگ بدر کا نتیجہ سُنا تو یہ جل بھُن گیا۔ سیدھا مکّے پہنچا۔ مقتولین کی تعزیت بھی کی اور اہلِ مکّہ کو مسلمانوں کے خلاف دوبارہ تلوار اُٹھانے کے لیے بھڑکایا۔ اُس نے ایک مہم کے طور پر مقتولین بدر کے مرثیے جگہ جگہ پڑھنے شروع کیے۔ لوگوں کو خوب رُلواتا۔ اسی سلسلے میں مختلف قبائل کا دورہ کیا۔ بعد ازاں مدینے آیا تو مسلمان خواتین کے نام لے لے کر عشقیہ اشعار پڑھتا اور حضورؐ کے خلاف ہجو کہتا۔ یعنی تحریکِ اسلامی کے جواب میں اچھّی خاصی تخریبی تحریک تن تنہا اُس نے اُٹھا رکھی تھی۔

ظاہر بات ہے کہ اپنے کرتوتوں کے لحاظ سے وہ دشمن کی صف کا آدمی تھا، مسلم جماعت اور اسلامی ریاست کے حق میں کھلا مجرم، اس کے خلاف اگر محمد بن مسلمہ ایک دستہ لے کر کارروائی کرنے گئے تو بہت ہی صحیح بلکہ ضروری اقدام تھا۔ اِس دستے نے کعب بن اشرف کو رات کے وقت ختم کیا۔ یہ ۱۴، ربیع الاوّل کا واقعہ ہے۔ یہود کو اطلاع ملی تو بڑے سراسیمہ ہوئے اور حضورؐ سے آ کر ملے۔ حضورؐ نے اس کے سارے کرتوت ان کے سامنے رکھے تو وہ دم بخود رہ گئے۔ پھر ان سے ایک عہد نامہ لکھوایا کہ یہود میں آئندہ کوئی شخص ایسی حرکات نہیں کریگا۔

غزوۂ غطفان کے بعد نبی ؐ اکرم نے ماہ ربیع الاوّل مدینے میں گزارا۔ ربیع الثانی کے اوائل میں رپورٹ ملی کہ مقامِ بحران جو حجاز کا معدن ہے، وہاں بنی سلیم مسلمانوں کے خلاف اقدام کرنے کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ حضور ؐ نے مدینے میں عبداللہ ابن ِمکتوم کو نائب بنایا اور تین سو صحابہ کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ بنی سلیم کو جب حضور ؐ کی روانگی کا علم ہوا تو وہ بکھر گئے۔

قریش بدر کے تجربے کے بعد اتنے خوف زدہ ہو گئے تھے کہ انھوں نے شام کا قدیمی تجارتی راستہ چھوڑ کر عراق کا راستہ اختیار کیا۔ جمادی الاُخریٰ میں مکّے سے ایک تجارتی قافلہ مالِ کثیر لے کے چلا۔ حضور ؐ تک خبر پہنچ گئی۔ آپؐ نے زید بن حارثہ کی سرکردگی میں ایک سو سپاہیوں کا دستہ قافلے سے تعرض کرنے کے لیے روانہ کیا۔ یہ مجاہدین جونہی قافلے کے سامنے پہنچے، اُنھوں نے حملہ کر دیا۔ سامان تجارت پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ مگر تمام لوگ قائدینِ قافلہ سمیت بھاگ گئے۔ صرف قافلے کے رہنما فرات بن حیان عجلی کو گرفتار کر لائے جو مدینے آ کر مسلمان ہو گئے۔ اس قافلے سے حاصل شدہ مالِ غنیمت کا جو خمس سرکاری خزانے میں داخل کیا گیا، اس کی مالیت ۲۰ ہزار درہم تھی۔

حضرت سیدنا عمر فاروق ؓ کی صاحبزادی جناب حفصہ ؓ کے شوہر حضرت خُنیس غزوۂ بدر میں شہید ہو گئے تھے۔ اب حضرت عمر ؓ کو اس بیوہ ہو جانے والی نوجوان بچّی کی فکر ہوئی۔ حضرتِ حفصہ ؓ کی قسمت کا ستارہ چمکا اور آپ تیسرے ہجری سال کے ماہ شعبان میں حرم نبوی میں داخل ہوئیں۔

پچھلے سلسلۂ واقعات سے اندازہ کیجیے کہ خدا کے رسول ؐ پر صرف واقعۂ بدر کے بعد کے چند ماہ میں کتنا زیادہ بار پڑا اور دفاعی ضرورت سے پے در پے سفر کرنے پڑے۔ ان واقعات سے یہ حقیقت بھی اخذ ہوتی ہے کہ دین تو شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے، اس کا دائرہ صرف محراب و منبر تک محدود نہیں ہے۔ پھر یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ دین کو کفر و شرک کے نظاموں کے مقابلے میں غالب کرنے کی کوشش کوئی کھیل نہیں، یہ ایک انقلابی مہم ہے جس میں قدم قدم پر سرفروشی اور جاں سپاری کرنی پڑتی ہے۔

تقریر ۱۷

غزوۂ احد

غزوۂ سویق کے بعد اگرچہ ابو سفیان کی قسم برائے انتقام بظاہر پوری ہو چکی تھی، مگر زیدؓ بن حارثہ کے ہاتھوں تجارتی قافلہ کے لٹنے کی وجہ سے ایک لاکھ درہم کا جو نقصان قریش کو پیش آیا تھا اور بدر کے قیدیوں کے فدیہ میں جو ۲½ لاکھ درہم دینے پڑے۔ ان کی وجہ سے مکہ میں تیز و تند جنگی جذبات کی لہریں اُٹھ رہی تھیں، اُنہی لہروں کے دباؤ کی وجہ سے ابو سفیان نے مدینہ پر چڑھائی کرنے کا اعلان کر دیا اور گلی کوچوں میں انتقام انتقام کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

جنگِ بدر کے وقت جتنا سامانِ تجارت شام سے آیا تھا اس کا منافع پہلے ہی جنگی فنڈ میں جمع تھا۔ اس میں اضافے کے لیے مزید جنگی چندہ قبائل مکہ سے اکٹھا کیا گیا۔[1] عمرو جمحی اور مُسافع دو شعرا نے عرب قبائل کا دورہ کیا اور جگہ جگہ اپنے اشعار سے لوگوں کے جذبات

---

[1] واقدی کی سند سے شاہ فرید الحق نے لکھا ہے کہ ۵۰ ہزار مثقال سونا جنگی مصارف میں لگایا گیا۔ اتنا ہی ریزرو فنڈ میں رکھا گیا۔ بار برداری کے لیے ایک ہزار اونٹوں کا انتظام کیا گیا۔

بھڑکائے۔ کنانہ اور تہامہ کے دو قبائل نے بھی قریش سے تعاون کا فیصلہ کیا۔ اس طرح مل کر ۳ ہزار سپاہیوں کا لشکر جمع ہوگیا۔ مکّہ سے روانہ ہوتے ہوئے ان لوگوں نے عورتوں کو بھی ساتھ لیا تاکہ اُن کی وجہ سے سپاہیوں میں غیرت کام کرے اور لوگ بھاگیں نہیں۔ یہ لشکر جبل اُحد کے قریب مقامِ عینین پر آکر فروکش ہوا۔

حضرت عباسؓ نے جو جنگِ بدر کے بعد ایمان لے آئے تھے مگر ابھی تبدیلی کو ظاہر نہیں کیا گیا تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تیز رفتار قاصد کے ذریعے قریش کی ساری تیاریوں اور عزائم سے آگاہ کر دیا۔ یہ قاصد لشکر کے پہنچنے سے تین دن پہلے حضورؐ کے پاس پہنچ گیا تھا۔

حضورؐ نے اطلاع پاتے ہی حضرت انسؓ اور حضرت مونسؓ کو لشکرِ کفّار کا کھوج لگانے کے لیے روانہ فرمایا۔ اُنھوں نے معلومات دیں کہ لشکر مدینے کے علاقے میں آگیا ہے اور چراگاہوں کو تباہ و برباد کر رہا ہے۔ پھر حضرت خباب بن الارت مزید کھوج کر کے آئے اور بتایا کہ مشرکین نے مدینے سے دو میل دور جبلِ اُحد کے قریب پڑاؤ ڈال دیا ہے۔

ادھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے سارا معاملہ مشورے کے لیے صحابہ کے سامنے رکھا۔ حضورؐ کی اپنی رائے یہ تھی کہ مدینے سے باہر نکلنے کے بجائے مدینے کے اندر رہ کر لڑا جائے۔ اتفاق سے راس المنافقین عبداللہ بن ابی کا نقطہ نظر بھی یہی تھا۔ مگر بہت سے جلیل القدر صحابہ کو اس سے اختلاف تھا۔ خصوصیت سے وہ صحابہ جو کسی وجہ سے شریکِ غزوۂ بدر نہ ہو سکے، اب ان میں بڑا جذبۂ بے تاب کام کر رہا تھا۔ اس فریق کی رائے یہ تھی کہ مدینے میں رہ کر لڑنے کی صورت میں دشمن ہم کو بزدلی کا طعنہ دیں گے اور ہمارے باغ اور کھیت اُجاڑ دیں گے۔ بادلِ ناخواستہ حضورؐ گھر تشریف لے گئے اور مسلّح ہو کر باہر آئے۔ جان نثار صحابہ کو کھٹک ہوئی کہ کہیں اُن کا یہ اصرار حضورؐ کو ناگوار تو نہیں گزرا۔ اُنھوں نے اپنی رائے واپس لینے کی پیش کش کی۔ مگر حضورؐ نے فرمایا ”نبی جب ہتھیار لگا لے تو جائز نہیں ہے کہ دشمن سے فیصلہ کیے بغیر اُنھیں اتارے“۔ مقصد یہ تھا کہ نبی جیسی عظیم المرتبت ہستی کے فیصلے ہوا کے جھونکوں کی طرح رُخ نہیں بدلتے۔ سوچنا اور بحث پہلے، فیصلہ بعد میں، اور جب فیصلہ ہو جائے تو پھر وہ اٹل۔ یہی مفہوم ہے ”فاذا عزمت فتوکل علی اللہ“ کا۔

محسنِ انسانیت، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک ہزار مجاہدین اسلام کے ساتھ ۶۔ شوال ۳ھ بعد نمازِ جمعہ کو مدینے سے اقدام کیا۔ حضرت ابنؓ ام مکتوم کو اپنے پیچھے قائمقام مقرر کیا۔ یہ لشکر جب مدینے اور اُحد کے درمیان ایک مقام شوط پر پہنچا تو عبداللہ بن اُبیّ تین ۳ سو منافقین کو ساتھ لے کر اسلامی فوج سے الگ ہو گیا۔ وجہ علیحدگی یہ بتائی کہ ہماری رائے کو چونکہ مانا نہیں گیا، اس لیے ہم اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے لیے تیاّر نہیں ہیں۔ اب صرف سات سو مجاہدین رہ گئے۔ رات کو یہیں پڑاؤ کیا گیا۔ رات کے آخری حصّے میں حضورؐ کے حکم سے لشکر نے کوچ کیا اور اُحد کے قریب جاکر نماز فجر ادا کی گئی۔

سینیچر کے روز نماز سے فراغت کے بعد حضورؐ نے مدینے کو سامنے اور اُحد کو پس پشت رکھ کر صف آرائی کرائی۔ یہ جگہ مدینے سے ۴ میل دُور تھی۔

اس غزوہ کا ایک اہم معاملہ جبل اُحد کے پیچھے ایک درّے کی نگرانی کیلئے پچاس تیر اندازوں کا تقرر تھا۔ جن کی کمان حضرت عبداللہ بن جُبیر کے سپرد تھی۔ حضورؐ نے امیر دستہ کو حکم دیا کہ ہم کسی بھی صورتِ حالات سے دو چار ہو جائیں تم لوگ اس درّے کو کسی حال میں نہ چھوڑنا۔[1]

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے علمِ جہاد حضرت مُصعب بن عُمیر کے سپرد کیا جنھوں نے رئیسانہ زندگی سے فقیرانہ حال تک اُتر کر بھی کمال دکھایا تھا اور معرکۂ اُحد میں بھی خاص مثال قائم کر دی۔ میمنہ میسرہ پر حضرت زبیر بن العوام اور منذر بن عمر کو مقرر فرمایا۔ اپنی تلوار حضرت ابو دُجانہ کو عنایت فرمائی جنھوں نے اس تلوار کا حق ادا کر دکھایا۔

قریش کے ۳ ہزار سپاہیوں میں سے، سو زرہ پوش تھے، دو ہزار گھوڑے اور تین ۳ ہزار اُونٹ ساتھ تھے۔ مردوں کو جنگ پر اُبھارنے کیلئے سردارانِ مکّہ کی خواتین موجود تھیں۔ جنگ کے وقت سب سے پہلے قریش کی عورتیں اشعار گاتی ہوئی بڑھیں۔ بعدازاں ابو عامر عبداللہ بن عمرو بن صیفی ۲ میدان میں نکلا۔ اُس نے قریش کو یہ جھانسہ دے رکھا تھا کہ میں جب سامنے جاؤں گا تو قبیلۂ اوس کے سارے لوگ مجھ سے آملیں گے۔ عملاً ہوا یہ کہ قبیلۂ اوس کے

---

[1] ارشاد یوں تھا کہ اگر تم دیکھو کہ ہماری بوٹیاں پرندے نوچے لیے جا رہے ہیں تو بھی تم اپنی جگہ سے نہ ہٹنا۔ (اصح السیر)

لوگوں نے پکار کر کہا کہ اے خدا کے فاسق اور نافرماں! خدا تیری آنکھ کبھی ٹھنڈی نہ کرے۔ ابو عامر کی بڑی بھد ہوئی اور وہ مُنہ لٹکائے واپس چلا گیا۔ عذر یہ کیا اب میرے قبیلے کے لوگوں کے دل بدل گئے ہیں۔ پھر طلحہ بن ابی طلحہ مبارزت کے لیے آیا اور مقابلے میں حضرت علیؓ نکلے جنھوں نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ پھر عثمان بن ابی طلحہ نے مُشرکین کا علم سنبھالا مگر حضرت حمزہ کی ضربِ شمشیر سے اس کا کام تمام ہوا۔ پھر اس کی جگہ ابو سعد بن ابی طلحہ نے جھنڈا اُٹھایا تو حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے تاک کر ایک تیر اس کے حلق پر مارا اور دوزخ میں پہنچا۔ پھر مسافع بن طلحہ آیا تو حضرت عاصم بن ثابتؓ کے ایک ہی وار نے اسے ملیا میٹ کر دیا۔

معرکہ جب گرم ہو گیا تو حضرت ابو دجانہ لپکے اور صفوں کو چیرتے چلے گئے۔ جو بھی سامنے آیا اس کا صفایا کر دیا۔ اہلِ مکّہ کی طرف سے شروع میں سباع بن عبدالعزّیٰ بھی مبارزت طلب ہوا۔ حضرت حمزہؓ کا ایک وار اس کے لیے کافی ثابت ہوا۔

وحشی بن حرب جُبیر بن مطعم کا غلام تھا، اس نے آزاد ہونے کی شرط پر حضرت حمزہؓ کو شہید کرنے کی ذمہ داری لی۔ کتنی بزدلانہ حرکت تھی کہ پتھر کی آڑ لے کر چھپ کر بیٹھا اور تاک کر ناف کے مقام پر نیزہ مارا جو پار ہو گیا۔ حضرت حمزہؓ لڑکھڑائے اور شہید ہو گئے۔

جنگ جب زوروں پر آئی تو مسلمانوں کے دلیرانہ حملوں کی وجہ سے قریشی بہادروں کے پاؤں اُکھڑنے لگے۔ آہستہ آہستہ اُن میں سے کچھ لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ اکساہٹ دلانے والی عورتوں نے بھی بھاگ کر پہاڑ کی پناہ لی۔ اب مسلمان صریحاً فاتح تھے، مگر وہ معرکے کی تکمیل سے پہلے ہی مالِ غنیمت سمیٹنے میں لگ گئے۔

حرصِ مال اور ضبط و نظم سے لاپروائی کے رہے سہے اثرات کام کر گئے اور ان کا خمیازہ مسلمانوں کو بھگتنا پڑا۔ جنگ کا پانسہ اپنے لشکر کے خلاف پلٹنے میں حضرت عبداللہؓ بن جُبَیر کے دستے کے کچھ افراد نے درّے کی جائے ماموریت کو چھوڑ دیا۔ حالانکہ حضورؐ نے سخت تاکید کی تھی کہ ہم پہ جو کچھ بھی گزرے تم جگہ سے نہ ہلنا اور حضورؐ کا اس نا کے کو اتنی اہمیّت دینا بتاتا ہے کہ آپؐ کی جنگی بصیرت کس درجے کی تھی! حضرت عبداللہ بن جُبَیر ساتھیوں کو روکتے رہ گئے، مگر چند افراد مالِ غنیمت سمیٹنے کے لیے جگہ چھوڑ گئے۔ اب حضرت عبداللہ کے ساتھ

دس افراد تھے۔ خالد بن ولید جیسے نوجوان سپہ سالار نے اِس اہم ناکے کو کمزور پا کر اِدھر سے حملہ کر دیا اور گیارہ کے گیارہ خدا پرستوں کو شہید کر دیا۔ یہ ایک اور بڑی غلطی تھی جس کی وجہ سے سزا اور بھی سخت ہو گئی۔ اس غیر متوقع ناگہانی حملے سے مسلمانوں کے علمبردار حضرت مصعب بن عمیر شہید ہو گئے۔ چونکہ حضرت مصعب کی شباہت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے ملتی جلتی تھی۔ اس وجہ سے یہ افواہ اُڑ گئی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا وصال ہو گیا۔ اس وحشت ناک افواہ نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ اب تو مسلمانوں میں دوست دشمن کی تمیز بھی نہ رہی۔ اپنا سامنے آیا تو اپنے پر ہی تلوار چلا دی۔

خالد بن ولید کے حملے سے اچھے اچھے دلیروں کے پاؤں اُکھڑ گئے مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم مقام استقامت پر جمے رہے۔ اس عالمِ اضطراب میں ۱۴ اصحاب حضورؐ کو جھرمٹ میں لیے رہے۔ سات مہاجرین اور سات انصار۔ ایک موقع پر جب قریشی مشرکین کا ریلا آیا تو حضورؐ نے پکار کر کہا کہ کون شخص ہمارے لیے اپنی جان کی بازی لگاتا ہے۔ اس پکار پر حضرت زیاد بن سکنؓ اور ان کے پانچ انصاری ساتھی اُٹھے اور ایک ایک کر کے سب حضورؐ کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اِنہی حضرت زیاد کا قصہ ہے کہ حضورؐ کے کہنے پر ان کے جسدِ بسمل کو جب قریب لایا گیا تو اُنھوں نے اپنے رخسار قدم مبارک سے لگا دیے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص کے بھائی عتبہ بن ابی وقاص کو موقع مل گیا تو اُس نے ایک پتھر ہی اُٹھا کر حضورؐ پہ وار کر دیا۔ پتھر چہرۂ مبارک پر لگا اور حضورؐ کا نچلا دانت شہید ہوا اور نچلا ہونٹ سخت زخمی۔ عبداللہ بن قمئہ نے ایک ایسا سخت وار کیا کہ رخسار مبارک زخمی ہوا اور خود کے دو حلقے رُخسار میں اُتر گئے۔ آنحضورؐ کے بدن پر چونکہ یوم اُحد کو دو زرہیں تھیں، لہٰذا ضربوں کی تکلیف اور بوجھ کی وجہ سے ایک گڑھے میں گر گئے۔ حضرت علیؓ نے حضورؐ کا ہاتھ پکڑا، حضرت طلحہ نے کمر سے سہارا دیا، حضورؐ کھڑے ہو گئے۔ اور فرمایا کہ "جو شخص زمین پر چلتے پھرتے زندہ شہید کو دیکھنا چاہے وہ طلحہ کو دیکھ لے" پہاڑ پر چڑھنے کے لیے خاصی مشکل پیش آئی۔ حضرت طلحہؓ نے بیٹھ کر پشت کو زینہ بنا دیا۔ حضورؐ ان کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر پہاڑ پر چڑھے۔

حضرت طلحہؓ نے دشمنوں کے اتنے حملے روکے کہ ان کی انگلیاں کٹ گئیں اور ستّر زخم ان کے بدن پر تھے۔ اسی طرح حضرت ابو دُجانہ نے بھی بڑی سرفروشی دکھائی اور بہت زخم کھائے۔ ایک مرتبہ تو آپ نبی اکرمؐ کے سامنے دشمنوں کی طرف پیٹھ کر کے ڈھال بن کر کھڑے ہو گئے اور جتنے تیر آئے انھیں اپنے بدن پر روکا۔

اس طوفانِ اضطراب میں سب سے پہلے حضرت کعب بن مالک نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو پہچانا اور بآوازِ بلند پکارے کہ اے مسلمانو! مبارک ہو کہ آنحضورؐ زندہ موجود ہیں۔ یہ آواز سنتے ہی ہر طرف سے اہلِ ایمان آآ کر آنحضورؐ کے گرد جمع ہونے لگے۔ یہ آواز جب مشرکین نے سنی اور مسلمانوں کو جمع ہوتے دیکھا تو انھوں نے اِدھر تیر برسانے شروع کر دیے۔ کتنے ہی تیر حضرت کعبؓ بن مالک نے اپنے سینے پر روکے۔ اسی اثنا میں ابیّ بن خلف گھوڑے پر سوار تیزی سے قریب آیا۔ اس موقع پر حضورؐ نے حارث بن صمہ سے نیزہ لے کر اس کی گردن پر مارا جس سے وہ بلبلا اُٹھا اور سیدھا مکّہ کی طرف مفرور ہوا۔ مقام سرف پر گھوڑے سے گر کر فی النار ہوا۔

لشکرِ کفّار نے بڑی بہیمیّت کا مظاہرہ کیا۔ مسلمانوں کی لاشوں کی بے حرمتی کی۔ ان کی ناکیں اور کان کاٹے اور پیٹ پھاڑ دیے۔ ابوسفیان کی بیگم صاحبہ نے تو اپنے باپ عتبہ کا بدلہ لینے کے لیے حضرت حمزہؓ کا نہ صرف چہرہ بگاڑا بلکہ جگر نکال کر چبایا اور حضرت حمزہؓ کے قاتل وحشی حبشی کو اپنا تمام زیور اتار کر انعام میں دیا۔ پھر مسلم شہداء کی لاشوں کے کٹے ہوئے کانوں اور ناکوں کا ہار پرو کر اسے گلے میں ڈالا۔

جب حضورؐ گھاٹی پر پہنچے تو لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ حضرت علیؓ نے چہرہ مبارک سے خون دھویا، سر پر پانی ڈالا۔ پھر حضورؐ نے اسی مقام پر وضو کیا اور بیٹھ کر نمازِ ظہر ادا فرمائی۔ صحابہ نے اقتدا کی۔

قریش نے جب واپسی کا ارادہ کیا تو ابوسفیان بلندی پر چڑھ کر پکارا "کیا تم میں محمدؐ زندہ ہیں؟" آنحضورؐ نے جواب دینے سے صحابہ کو منع فرمایا۔ تین دفعہ پکارنے کے بعد کہا کہ ابوبکر صدیقؓ ہیں، پھر کہا عمر خطابؓ ہیں۔ ان ناموں کو بھی اس نے تین بار پکارا۔ جواب

نہ ملنے پر خوش ہو کر ساتھیوں سے کہنے لگا:

"سب قتل ہو گئے اگر زندہ ہوتے تو ضرور جواب دیتے"

حضرت عمرؓ اس بات کی تاب نہ لا سکے اور بآوازِ بلند کہا کہ او دشمنِ خدا! خدا کی قسم، تو نے غلط کہا، تیرے لیے غم و رنج کا سامان باقی ہے"

پھر ابو سفیان نے نعرہ لگایا "اے ہبل! تو سر بلند ہو" حضورؐ کے حکم سے حضرت عمرؓ نے جواب دیا "اللہ سب سے برتر اور سب سے بڑا ہے" پھر ابو سفیان نے کہا "عزیٰ دیوی ہماری ہے، تمھاری نہیں" حضرت عمرؓ نے جواب دیا "اللہ ہمارا مددگار ہے، تمھارا نہیں" ابو سفیان بولا: "جنگ اُحد جنگ بدر کا بدلہ ہے۔ اب ہم اور تم دونوں برابر ہیں" حضرت عمرؓ نے جواب دیا: "برابری نہیں ہے، ہمارے آدمی جنت میں ہیں، تمھارے جہنم میں ہیں" آخر ابو سفیان نے کہا کہ اب ہمارا تمھارا مقابلہ آئندہ سال بدر میں ہو گا۔

جنگ کے خاتمہ پر حضورؐ نے شہداء کی لاشوں کا معائنہ کیا اور حضرت حمزہؓ کی لاش تلاش کرائی۔ حضورؐ نے بڑی رقت سے دُعا کی "تم پر اللہ کی رحمت ہو" بعض شہدا کی لاشیں ان کے ورثا مدینے میں بھی لے گئے۔ مگر حضورؐ نے فرمایا کہ ان کو مقامِ شہادت پر ہی دفن کیا جائے۔

غزوۂ احد کا دن مسلمانوں کے لیے سخت غم و رنج اور ابتلا کا دن ثابت ہوا۔ بہت سے جلیل القدر صحابہ شہادت پا گئے۔ اس معرکے میں چالیس مسلمان زخمی اور ستر شہید ہوئے۔ دشمن کے ۳۰ آدمی مارے گئے۔

قریش جب احد سے واپس جاتے ہوئے مقام روحاء پر پہنچے تو اُنھیں خیال آیا کہ وہ کام کی تکمیل سے پہلے ہی پلٹ آئے ہیں۔ مسلمان اس وقت زخم رسیدہ ہیں لہٰذا اگر اب پلٹ کر حملہ کر دیا جائے تو وہ تاب نہ لا سکیں گے۔ رسولؐ کریم کے مخبروں نے اس بات کی اطلاع حضورؐ کو پہنچا دی۔ حضورؐ نے حضرت بلالؓ کے ذریعے منادی کرائی کہ مدینے کے تمام لوگ جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ ۸ شوال کو مدینے سے چل کر حضورؐ نے ۸ میل دور مقام حمراء الاسد پر قیام کیا۔ قبیلۂ خزاعہ کا سردار مَعبد خزاعی حضورؐ کے سامنے غزوۂ اُحد کے شہدا کی تعزیت کے لیے آیا تھا۔ یہاں سے لوٹ کر وہ ابو سفیان سے ملا۔ ابو سفیان نے جب

اپنا بنا بنایا پروگرام بتایا تو معبد نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بڑی عظیم الشان فوج کے ساتھ تمہارے تعاقب اور مقابلے کے لیے نکلے ہیں۔ ابوسفیان نے یہ سنتے ہی مکّہ کی راہ لی۔

رسولِ برحق حمراءالاسد کے مقام پر تین دن ٹھہرے۔ پھر جب لشکرِ مکّہ کی واپسی ہوگئی اور فضا صاف ہوگئی تو مدینے واپس آ گئے۔ اس موقع کے متعلق صحابۂ کرام کی شان میں یہ آیت نازل ہوئی:

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ ۚ (آل عمران۔ ۱۷۲)	وہ لوگ جنھوں نے زخم رسیدگی کے بعد خدا اور اس کے رسولؐ کے حکم پر لبیک کہی، سو جو لوگ بھی ان میں سے خوش کردار اور اہلِ تقویٰ ہیں ان کے لیے اجرِ عظیم ہے۔

ہم آئندہ گفتگو میں غزوۂ اُحد کے بعض خاص سبق آموز پہلوؤں کا ذکر کریں گے۔

تقریر ۱۸

غزوۂ اُحد کے اہم اسباق

غزوۂ بدر اپنی اوّلیت، پھر یوم الفرقان ہونے اور پھر اللہ کی نصرت سے کم تعداد و اسلحہ والے گروہ کے فتح یاب ہونے کے باعث تاریخِ اسلامی کا بہت بڑا سنگ میل ہے اور اس کے اثرات مسلمانوں کی تمام حربی تاریخ پر پڑے ہیں۔

لیکن غزوۂ اُحد بھی ایک سنگِ میل ہے اور اپنی جگہ بعض غیر معمولی اہمیتیں، دروس عبرت اور اسباقِ عزیمت اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ غزوۂ اُحد میں اگرچہ مسلمان بھرپور فتح حاصل کرنے سے رہ گئے، مگر ظاہر کے لحاظ سے معاملہ کچھ ایسا برابر سرا بر رہا کہ ابو سفیان تک نے جاتے جاتے پکار کر یہ کہا کہ اب ہم تم برابر ہیں، تیار رہو، اگلے سال ہم خبر لیں گے۔ لیکن ابو سفیان کی توجّہ اس نکتے کی طرف نہیں گئی کہ ایک قوّت جو حضورؐ محسنِ انسانیت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کی قیادت میں اُٹھی تھی اور جو اب تک بے سر و سامانی اور ناسازگاریٔ احوال کی وادیاں عبور کر رہی تھی، آج اُس کی مخالف کثیر التعداد، سرپھری اور تکبّر پسند قوّت کا لیڈر اپنی زبان سے اعتراف کر رہا تھا کہ تم ہمارے برابر کی قوّت ہو۔ غزوۂ اُحد کے اگر اسی ماحصل کو، جو دُشمن کی رائے کے مُطابق تھا، صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس کے معنی یہ ہیں کہ غزوۂ اُحد

بھی ایک نوع سے فتح تھی۔ اخلاقی برتری اس سے الگ۔

اس غزدہ کے چند پہلو اپنے اندر خاص سبق رکھتے ہیں۔ یہاں ہم اُنھیں بیان کرتے ہیں۔

(۱) تحریکوں کی یہ شان ہوتی ہے کہ وہ مخالف کیمپ میں بھی ایسے حامی پیدا کر لیتی ہیں جن کا جذبۂ حمایت بعض نازک موقعوں پر کام آتا ہے۔ بظاہر اس کا کوئی خاص اہتمام نہ تھا کہ مکّہ کی فوجی سرگرمیوں کی باقاعدہ اطلاع مدینے میں پہنچتی رہتی۔ مگر وہاں حضرت عباسؓ کی شخصیت ایسی تھی کہ شروع ہی سے جھکاؤ آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف تھا۔ آہستہ آہستہ تعلّقِ خاطر بڑھتے بڑھتے مرتبۂ ایمان تک پہنچ گیا۔ مگر مصلحتاً اپنے ایمان کو آشکار کر کے مکّہ سے ہجرت ابھی نہ کی تھی۔ چنانچہ وہی اس بات کا ذریعہ بنے کہ مشرکین مکّہ کی جنگی تیاریوں کی اطلاع آنحضورؐ تک پہنچی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید مکے والوں کی جنگی کارروائی زیادہ مشکلات کا باعث بنتی۔[۱]

(۲) دوسرا بڑا سبق یہ ملتا ہے کہ اسلام میں مشورے کی شدید اہمیت ہے۔ حضورؐ اگر حکم دے دیتے کہ لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ اور مدینے میں رہ کر لڑنا ہے تو کوئی چوں وچرا نہ کرتا۔ مگر حکمِ خدا کے تحت مشورہ کرنا اور مشورت کی تربیت دینا ضروری تھا

مسجد میں صحابہ کا اجتماعِ عام ہوا۔ حضورؐ نے سارا معاملہ ان کے سامنے رکھا اور ساتھ ہی اپنی رائے بھی دی کہ مدینے میں رہ کر لڑنا مناسب ہوگا۔ مگر ایسا نہیں کہا کہ دوسروں کے مُنہ بند کر دیے ہوں یا حاضرین نے جراٗتِ گفتار سے کام نہ لیا ہو۔ جماعتِ منصوص

---

[۱] یوں تو جنگی تناتنی ابو سفیان نے پہلے سے پیدا کر دی تھی۔ اُس نے اسلامی جماعت کو بڑا سخت خط لکھا تھا اور اس میں کہا تھا کہ قریش نے کعبہ میں قسم کھائی ہے کہ لات کی عزّت کا تحفظ کیا جائے اور ہم لوگ آس پاس کے لوگوں کو جمع کر کے عنقریب گھوڑوں پر سوار ہو کر تم لوگوں کو ملیامیٹ کر دیں گے۔ اشارہ یہ بھی تھا کہ تمھاری مسجدوں کو ڈھا دیں گے۔ نیز اس خط میں مدینے کی آدھی پیداوار بطورِ خراج طلب کی گئی تھی۔ اس خط کا جواب حضورؐ نے بھی بڑے جوشیلے الفاظ میں لکھوایا۔

احکامِ خدا و رسولؐ کے سامنے تو عاجزی سے سر جھکا دیتی تھی مگر مشورے کے دائرے میں کھل کر بات کرتی تھی، چنانچہ اس مجلس میں بہت سے صحابہؓ نے بڑے جوش و خروش سے تقریریں کیں اور زیادہ تر تقریروں میں حضورؐ کی رائے سے اختلاف کیا گیا تھا۔ حضرت خیثمہؓ، ابوسعد بن خیثمہ، نعمان بن مالک اور سعد بن عُبادہ کا یہی نقطۂ نظر تھا۔ اور جناب حمزہؓ تو پرزور طریق سے بار بار یہ رائے دیتے کہ لڑائی مدینے سے باہر ہوگی۔ ایاس بن اوس بن عتیک کا کہنا تو یہ تھا کہ اگر ہم مدینے میں رہ کر لڑیں گے تو یہ لوگ بعد میں طعنے دیں گے ہم نے ان کو مدینے کے اندر ہی گھیر لیا اور نکلنے نہیں دیا، نیز ہمارے باغ اور کھیت سب اُجاڑ دیں گے۔

اِدھر حضورؐ کا انداز بھی یہ نہیں تھا کہ ایک بار جو رائے دے دی ہے۔ اس کے خلاف کتنے ہی لوگ کیوں نہ زور شور سے اپنا نقطۂ نظر بیان کریں، بس اپنا مؤقف نہیں چھوڑنا۔ نہیں، سردارِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے جب جماعت کے عمومی رجحان کو واضح طور پر دیکھ لیا تو ردّوکد کے بجائے فوراً اس رجحان کو قبول کر لیا۔ پھر مسجد سے گھر تشریف لے گئے اور ہتھیار لگا کر واپس آئے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ساتھ ہی گئے تھے اور زرہ وغیرہ پہنانے میں مدد کی تھی۔

بعد میں سعد بن معاذ متفکر ہوئے اور ساتھیوں کو توجہ دلائی کہ شاید تم لوگوں نے اچھا نہیں کیا، بہتر ہے کہ رائے واپس لے لو۔ ہماری رائے منشائے نبویؐ کے خلاف نہیں ہونی چاہیے۔ اُسَید بن حُضیر نے بھی تائید کی۔ حاضرین میں شرمندگی کی لہر سی دوڑ گئی۔ حضورؐ ہتھیار لگا کر آئے تو سب نے عرض کیا کہ شاید ہم نے رائے دینے میں غلطی کی ہو، آپ جو مناسب سمجھیں، اُسی پر عمل کریں۔ حضورؐ نے جواب دیا کہ کسی نبی کے شایانِ شان یہ بات نہیں ہو سکتی کہ وہ جب زرہ پہن لے تو پھر دشمن سے لڑے بغیر اسے اُتار دے۔ تم صبر سے کام لو، اللہ تعالیٰ فتح دے گا۔

حضورؐ نے وہ کھٹکا بھی دُور کر دیا جو اختلافِ رائے کی وجہ سے صحابہؓ میں پیدا ہوا۔

(۳) حضورؐ کا طریقہ یہ رہا کہ اپنے مختلف رفقا کو ذمہ داریاں سونپتے اور مناصب ان میں تقسیم کر دیتے۔ مثلاً اسلامی فوج کے مستقلاً اور اس غزوہ کے وقتی طور پر سپہ سالار

حقیقت میں آپ ہی تھے۔ مگر آپ نے فوج کا سالار حضرت زبیر بن العوام کو مقرر کیا۔ مُصعب بن عُمیر کو علمبرداری کا اعزاز دیا۔ فوج کے سامنے دو ممتاز اصحاب ہاتھوں میں پرچم لیے چل رہے تھے۔ ایک سردارِ خزرج سعد بن عبادہ، دوسرے رئیسِ اُوس سعد بن معاذ

(۴) مقامِ شیخین پر لشکر کی صف بندی کرا کے حضورؐ نے معائنہ فرمایا۔ متعدد کم عُمر لڑکے بھی صفوں میں شامل تھے۔ مثلاً زید بن ثابت، عبداللہ بن عمرؓ، ابو سعید خدری، اُسید بن زُبیر، براء بن عازب، عرابہ اوسی۔ ان سب کو حضورؐ نے لشکر سے الگ کرا کے واپسی کا حکم دیا۔ حضرت زبیرؓ نے حکم کی تعمیل کی۔ اب سُمرہ بن جُندب سامنے آئے۔ حضورؐ نے اُن کو بھی الگ کرا دیا۔ وہ الگ تو ہوئے مگر دل بہت غمگین تھا۔ چلتے چلتے حضور جب رافع بن خدیج تک پہنچے تو سُمرہ کی پوری توجہ ادھر مرتکز ہوگئی کہ ان کے لیے کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ حضورؐ آگے نکل گئے اور رافع بن خدیج صف میں کھڑے رہ گئے۔ دراصل رافع نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اپنے تئیں دوسروں کے ساتھ ملا لیے تھے۔ اب تو سمرہ بے تاب ہو گئے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ قد اور قوت میں وہ اور رافع برابر سرابر ہیں۔ دوڑے دوڑے اپنے بزرگ مُرّی بن سنان کے پاس گئے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا کہ رافع جہاد میں شریک ہو رہا ہے حالانکہ میں اُسے کشتی میں پچھاڑ سکتا ہوں۔

معاملہ حضورؐ تک پہنچا۔ دونوں کو بُلایا گیا۔ کُشتی ہوئی اور سُمرہ بن جُندب نے واقعی رافع بن خدیج کو پچھاڑ دیا۔ نتیجہ یہ کہ ان کو بھی شرکتِ جہاد کی اجازت مل گئی۔

اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جنگ جیسی خوفناک آگ جس سے لوگ جانیں بچاتے ہیں، اس کے لیے اسلامی تحریک کے نوخیز جوان کیا جذبۂ بے تاب رکھتے تھے۔ آخر اُن کے سامنے تو جہاد فی سبیل اللہ کا راستہ تھا، نہ کہ کسی دنیوی جنگ کا!

(۵) مدینہ سے جہاد کے لیے نکلتے ہوئے رسولِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نابینا صحابی حضرت ابن ام مکتوم کو قائم مقام مقرر کیا۔ اس سے جہاں حضورؐ کی نگاہ میں حضرت ابن ام مکتوم کا مقام ظاہر ہوتا ہے (اور وہ بعض دوسرے مواقع پر بھی نمایاں ہوتا رہا) وہاں اصولی حقیقت یہ قابلِ توجہ تھی کہ حضورؐ کی نگاہ میں نظم شدید اہمیت رکھتا تھا اور مدینے

سے باہر جاتے ہوئے اس کے حالات و معاملات کو پراگندہ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

(۶) لشکر جب مقام شیخین پر پہنچا تو رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی اپنے تین سو پیروکاروں کے ساتھ حضورؐ کے اسلامی لشکر سے الگ ہوگیا۔ وجہ علیٰحدگی اُس نے یہ بیان کی کہ میری رائے نہیں مانی گئی تو پھر کیوں ہم لوگ بلاوجہ اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈالیں۔ یہ منافقانہ کردار تاریخِ اسلامی میں اپنی ایک مستقل نوعیت رکھتا ہے۔ اس کا معیارِ تعلق دین کے اصول و احکام نہیں ہوتے بلکہ انقطاع کے لیے اتنی ہی بات کافی ہوتی ہے کہ ہماری رائے پر عمل نہیں کیا گیا یا ہماری لیڈری نہیں مانی گئی۔ مصلحتوں اور تدبیروں کے دائرے میں جہاں رایوں کا اختلاف ہر ہر قدم پر ہونا ضروری ہے وہاں اگر اجتماعی فیصلوں اور امارت کے احکام کو نہ مانا جائے تو پھر کوئی شخص نظمِ جماعت میں نہیں چل سکتا اور اگر سب لوگ ایسے ہی ہوں تو کوئی جماعت نہیں چل سکتی۔ کوئی بھی ایسا نظامِ جماعت جو اقامتِ دین کے لیے کام کرنے کو قائم ہوا ہو اور مجموعی طور پر لوگ مخلص ہوں اور فیصلے نصوص کے دائرے کے اندر مشورے سے ہوتے ہوں، اُس سے محض اختلافِ آراء کو بہانہ بنا کر الگ ہوجانا ایک غیر واجب حرکت ہے اور ایسی علیٰحدگی اگر نازک مراحلِ کشمکش میں ہو تو پھر یہ علامتِ نفاق بھی ہوسکتی ہے۔ کسی فرد یا گروہ کی انا کا اتنا زوردار ہوجانا کہ وہ تحریک اور جماعت کے مجموعی مفاد کی پروانہ کرے، بہت بڑی بیماریٔ دل ہے۔ اسی طرح افراد یا سربراہوں سے شخصی طور پہ رنجیدہ ہونے کا انتقام جماعت اور تحریک سے لینا بڑی خطرناک حرکت ہے۔

عبداللہ بن ابی نے یہی کیا کہ اپنی رائے کو اپنی انا کی سرمستی میں اتنا اہم قرار دیا کہ جماعت اور تحریک کے لیے عین میدانِ جنگ میں پہنچ کر نازک صورتِ حالات پیدا کر دی۔ یہ ایک طرح سے حضورؐ کی مہم اقامتِ دین کی پیٹھ میں چھرا گھونپنا تھا۔ اُسے تو دراصل مرضِ نفاق لاحق تھا جس کا مریض کام خراب کرنے کے لیے بہانے ڈھونڈتا ہے۔

ایسے لوگ ایک صحت مند اجتماعیت سے الگ تو ہوجاتے ہیں، مگر الگ ہوکر عین اپنے ہی قائم کردہ اصول و معیار پہ کوئی کام کر کے دکھا نہیں سکتے۔ عبداللہ بن ابی

اور اس کے تین سو ساتھیوں کا کوئی کارنامہ تاریخ میں اس کے سوا محفوظ نہیں ہے کہ انھوں نے جب بھی موقع پایا، خدا کے رسولؐ اور ان کے رفقا کے کام میں خلل ڈالا۔ کسی سچے مسلمان کا یہ کام نہیں کہ اقامتِ دین کے لیے کام کرنے والے کسی دینی نظام جماعت سے محض ذاتی رائے منوانے کے لیے الگ ہو، خاص طور پر ایسی بے معنی علیٰحدگی اگر کسی اہم مرحلۂ کش مکش میں اختیار کی جائے تو اس کا فائدہ تحریکِ اقامتِ دین کے مخالفین ہی کو ملتا ہے۔

دوسری طرف ان اصحابِ ایمان و یقین کا کردار بھی بڑا مثالی ہے جو پہلے ہی اپنی قوّت کو بہ لحاظِ تعداد اور اسلحہ دشمن سے کم پا رہے تھے اور عین آخری لمحے اس قوّت کا بھی ایک تہائی حصّہ اُن سے الگ ہو جاتا ہے اس پر بھی وہ اپنے ایمانی موقف اور عزائم جہاد پر قائم رہتے ہیں۔

(۷) جنگ کے آغاز سے پہلے جب دونوں لشکر تیار کھڑے تھے، مدینہ منوّرہ کا ایک مقبولِ عام شخص ابو عامر عبداللہ بن عمرو بن صَیفی میدان میں آیا۔ قبیلۂ اوس کا یہ سابق سردار اپنی پارسائی کی وجہ سے راہب کہلاتا تھا۔ مدینہ میں جب اسلام کو فروغ ہوا تو اس شخص کے مخالفانہ جذبات اسے مکّہ لے گئے۔ یعنی اس شخص کا تقویٰ نبی اکرمؐ کی اسلامی جماعت سے تو سازگاری نہ کر سکا، مکّہ کے جاہلیت زدہ مشرکوں کے ہاں اسے تسکین ملی یہی وہ حرکت تھی جس کی وجہ سے اس کا سارا روحانی طلسم ٹوٹ گیا۔ آنحضورؐ کے حلقوں میں اسے ابو عامر راہب کے بجائے ابو عامر فاسق کہا جانے لگا۔

دراصل ابو عامر نے قریش کو یہ یقین دلا رکھا تھا کہ قبیلۂ اوس کے لوگ مجھ پر اتنا اعتماد کرتے ہیں کہ میں جب ان کے سامنے میدان میں نکلوں گا تو وہ سب میرے گرد جمع ہو جائیں گے۔ وہ میدان میں نکلا، مگر اوس کا کوئی آدمی اس کی طرف نہیں بڑھا، بلکہ اس کی پکار کے جواب میں یہ صدا گونجی کہ او خدا کے فاسق، خدا کبھی تیری آنکھ ٹھنڈی نہ کرے۔ ابو عامر گردن جھکائے واپس چلا گیا اور قریشی لشکریوں سے یہ کہا کہ میرے بعد میرے قبیلے کی ذہنیتیں بدل گئی ہیں۔

اس شخص پر شاید اصل حقیقت اُس وقت بھی واضح نہ ہوئی ہو کہ وہ خود ایک کھوٹا سکّہ بن چکا تھا۔ ایسے تمام لوگ جو معتمد علیہ دینی حلقوں سے نفوذ ہو کر لادینی عناصر کی صفوں میں جا شریک ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ کھوٹے ہو جایا کرتے ہیں۔

(۸) باوجودیکہ اُحد میں مسلمانوں کو مشکل حالات کا مقابلہ کرنا پڑا، مگر انھوں نے ذرا کمزوری نہیں دکھائی بلکہ شجاعت اور قربانی کی بڑی عظیم الشان مثالیں قائم کیں۔

مبارزت کے مرحلے میں حضرت علیؓ، سعدؓ بن ابی وقّاص، حضرت عاصمؓ بن ثابت اور حضرت حمزہؓ کے ہاتھوں لشکرِ مشرکین کے علمبردار سمیت پانچ سردار جہنم رسید ہوئے۔

حضرت ابو دُجانہؓ کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ اُنھیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی خاص تلوار اس شرط کے ساتھ عطا کی کہ اس کا حق ادا کرو اور وہ حق یہ ہے کہ کوئی مسلمان اس کی زد میں نہ آئے اور کوئی کافر اس سے بچ کے نہ جائے۔ اس شرف کو پا کر سر پر سُرخ رومال باندھے خاص ادا سے اٹھلاتے ہوئے حضرت ابو دجانہ آگے بڑھے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ خدا کو یہ چال نہایت ناپسند ہے، مگر اس وقت یہی مناسب ہے۔ یعنی میدانِ جنگ میں دُشمن کے سامنے انکساری دکھانے کے بجائے سر و سینہ کو تان کر ہی چلنا چاہیے۔ پھر حضرت ابو دجانہؓ نے واقعی اس تلوار کا حق ادا کیا اور جدھر جاتے، دشمن کی صفوں میں بے دریغ بڑھتے چلے جاتے اور جس طرف تلوار کو لہراتے مشرکین کے لاشے تڑپ جاتے۔ تقریباً یہی صورت حمزہؓ کی تھی۔ بقیہ مسلم مجاہد بھی بے جگری سے لڑے، یہاں تک کہ دشمن کے قدم اُکھڑ گئے۔

حضرت مُصعبؓ بن عُمیر جیسے نوجوان نے علمبرداری کا حق ادا کر دیا۔ ابن قمئہ کے وار سے داہنا ہاتھ کٹ گیا تو فوراً بائیں ہاتھ میں علم تھام لیا۔ دُشمن نے بائیں ہاتھ کو بھی کاٹ دیا تو دونوں کٹے ہاتھوں کے سِروں سے علم کو سینے کے ساتھ دبا لیا۔ آخر جب ان کو شہید ہی کر دیا گیا تو باری باری دوسرے ساتھیوں نے علم کو سر بلند رکھا۔
یہ مُصعبؓ بن عُمیر مکّے کے ایک بانکے خوش پوش نوجوان تھے مگر اسلام لانے کے بعد ایسے درویش بنے کہ کپڑے پھٹے ہوتے اور بال بکھرے ہوئے۔ شہداء کے معائنہ کے

وقت ان کی نعش کو دیکھ کر حضورؐ نے بڑے گہرے تاثر کا اظہار کیا۔ ان کے بدن کو ان کی چادر سے ڈھانکنا مشکل تھا۔ سر کو چھپاتے تو پیر کھلے رہتے، پیروں پر ڈالتے تو سر باہر رہتا۔ آخر پیروں پر گھاس کی تہ رکھی گئی۔

(۹) لشکرِ مکّہ کے لوگ جب بھاگنے لگے اور عورتوں نے پہاڑ پر جا پناہ لی تو مسلمانوں نے یہ سمجھ کر کہ کھیل تمام ہوا، مالِ غنیمت سمیٹنے پر اپنی توجّہ مرکوز کر دی۔ یہ دیکھ کر درّے کی نگرانی کرنے والی جماعت جو حضرت عبداللہ بن جُبَیر کی کمان میں مامور تھی، اس کے کچھ افراد بھی مالِ غنیمت سمیٹنے کے لیے لپکے۔ حضرت عبداللہ بن جُبَیر نے ان کو روکنے کی بڑی کوشش کی، مگر بے سود۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی صریحاً نافرمانی تھی۔ اور اس نافرمانی کی بہت بڑی سزا مسلمانوں کو ملی۔ اس درّے کے ناکے کو کمزور پا کر پیچھے سے خالد اپنے دستے سے ساتھ حملہ آور ہوا اور عبداللہ بن جُبَیر اور ان کے ساتھیوں کا خاتمہ کر کے میدانِ جنگ کی طرف بڑھا۔ قریش کی بھاگتی ہوئی فوج بھی پلٹ کر پھر حملہ آور ہو گئی۔ اس ناگہانی اُفتاد سے مسلمانوں کے اوسان خطا ہو گئے اور ان کا سارا نظم ٹوٹ گیا۔ آپس میں ایک دوسرے کا خون بہانے کی نوبت آگئی۔

یہ انتباہ تھا اس بات کا کہ خدا کے ہاں کوئی جماعت بھی ایسی چہیتی نہیں ہے کہ وہ جو غلطیاں چاہے کرتی رہے گرفت نہ کی جائے۔ جو غلطی کرے گا اسے قانونِ الٰہی کے تحت خمیازہ بھگتنا ہو گا۔ دولت کی حد سے بڑھی ہوئی حرص ایسی بنیادی کمزوری تھی جس کی وجہ سے جنگ کو تکمیل تک پہنچانے سے پہلے، بغیر سپہ سالار کے اِذن کے سپاہی مالِ غنیمت کی طرف متوجہ ہو گئے اور اسی رَو میں ناکے والوں نے اپنا ناکہ چھوڑ دیا۔

سزا اتنی ہی نہیں ملی، بلکہ اس کا دائرہ اور بھی وسیع تھا۔ خالد بن ولید کے حملے سے اگرچہ اچھے اچھے بہادروں کے پاؤں بھی سراسیمگی کی وجہ سے اُکھڑ گئے مگر آنحضورؐ کا پائے ثبات اپنی جگہ جما رہا۔ اوسطاً ۱۴ اصحاب (۷ مہاجر اور ۷ انصار) حضورؐ کے ساتھ رہے۔ اس تعداد میں تھوڑی بہت کمی بیشی ہوتی رہی۔ ایسی حالت میں عتبہ بن ابی وقاص نے موقع پا کر ایک پتھر پھینکا جس کی ضرب سے حضورؐ کا نیچے کا ایک دانت شہید اور

نچلا لب زخمی ہوا۔ پھر عبداللہ بن قمئہ نے اس زور سے حملہ کیا کہ رخسارِ مبارک زخمی ہوا اور خود کے دو حلقے جبڑے کی ہڈی میں اُتر گئے۔ تیسرا وار عبداللہ بن شہاب زہری کا تھا جس کے پتھر سے جبینِ مبارک زخمی ہوئی۔ اس تند و تیز ریلے میں حضورؐ دو زرہوں کے بوجھ کی وجہ سے قریبی گڑھے میں گر گئے۔ حضرت علیؓ اور طلحہؓ نے سہارا دے کر اُٹھایا اور حضورؐ پہاڑ پر چڑھے۔

(۱۰) سزا کا تیسرا پہلو یہ تھا کہ علمبردارِ لشکر حضرت مُصعب بن عُمیرؓ کے چہرے میں چونکہ کچھ اندازِ شباہت حضورؐ کے رُخِ انور کے تھے، اس وجہ سے اُن کی شہادت واقع ہونے پر یہ افواہِ بد اُڑ گئی کہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم شہادت پا گئے۔ اس افواہ سے انتشار و اضطراب اور بڑھا۔ مسلمانوں کے اندر ایک جذبہ یہ پیدا ہوا کہ اب جب کہ خدا کے رسول ہم میں نہیں رہے، اب لڑ کر کیا لینا۔ یہ جذبہ بھی ایک لحاظ سے فطری تھا، کیونکہ دشمنوں میں گھرے ہوئے مسلمانوں کی قوّت کا بڑا مظہر رسولِ اکرمؐ کی ذات اور آپ کی رہنمائی ہی تھی۔ مگر کوئی بھی نقطۂ نگاہ جو مایوسی اور ترکِ عمل کی طرف لے جائے اس کے پیچھے چاہے کوئی فطری جذبہ کام کر رہا ہو، اسلامی تحریک میں جگہ نہیں پا سکتا۔ لہٰذا اس کا دوسرا جواب مسلمانوں کے اندر یہ ابھرا کہ اب جبکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں نہیں رہے تو ہم جانیں بچانے کی فکر کیوں کریں۔ محمدؐ اگر نہیں رہے تو محمدؐ کا ربّ تو زندہ ہے۔ کیوں نہ پوری قوّت سے لڑ کر شہید ہو جائیں۔ یہ بات اُنس بن نضر کی زبان سے للکار بن کر اُبھری۔ جناب اُنس خود بھی دشمنوں کے ہجوم میں لڑتے ہوئے گُھس گئے اور بہت سے دوسرے مسلمان بھی۔ یہاں تک کہ حضورؐ کے زندہ موجود ہونے کی پُرمسرت خبر پھیل گئی۔

اسی موقع کے متعلق آیت "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ . . . ." (آل عمران ۱۴۴) نازل ہوئی جس میں مسلمانوں کو صاف صاف سُنا دیا گیا کہ جنابِ محمدؐ دائمی حیاتِ دنیوی لے کر نہیں آئے، وہ خدا کے رسول ہونے کے ماسوا جسمانی لحاظ سے انسانی وجود ہیں، اُن پر موت واقع ہو سکتی ہے، اُن کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ رسول کوئی مافوقِ جبلت مخلوق نہیں ہے۔ ان سے پہلے بھی رسول گزرے ہیں وہ سب وفات پا چکے (ان میں سے بعض

کو دشمنوں نے قتل بھی کیا) پھر کیا تم رسولؐ کی حیاتِ عنصری کے ختم ہونے پر اُس ایمان اور دین اور تحریک اور کشمکش کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوگے جسے رسولؐ نے تم تک پہنچایا ہے۔ خدا اگر حیّ و قیوم ہے۔ دینِ حق اگر باقی ہے۔ اقامتِ دین کی مہم اگر جاری ہے تو تمہاری پوری قوتیں اس میں کھپ جانی چاہئیں۔ رسول کی زندگی میں بھی، اور زندگی کے بعد بھی۔

معلوم ہوا کہ رسولوں کا کام خدائے زندہ سے انسان کا تعلّق اُس دینی نقشے پر استوار کرنا ہے جس کے ہر نقطے اور ہر گوشے کو وہ اُمت پر وحی کی روشنی میں اپنے قول اور عمل سے پوری طرح واضح کرتے ہیں، اور خدا سے یہی تعلق انسان کا انسان سے تعلق بھی ہر دائرے اور شعبے میں ایک خاص نہج سے جوڑتا ہے۔ یعنی عبادت خدا کی مطلوب ہے، کوئی رسول اپنی عبادت کرانے نہیں آتا اور یہ نہیں سکھاتا کہ میں اگر نہ رہا تو خدا کی عبادت و اطاعت کی مختلف لازم و مطلوب اشکال کو چھوڑ دینا۔ وہ اپنی تعلیم دعوت اور اپنے اسوہ و سُنت کی شکل میں خدا پرستانہ زندگی کے تمام تقاضے مرتب کر کے چھوڑ جاتا ہے اور جب تک اس کی یہ میراث باقی رہتی ہے اس کی رسالت کا دور بھی جاری رہتا ہے۔ یعنی اس کا دورِ رسالت اور اس کے حقوقِ رسالت اس کی جسمانی موت سے ختم نہیں ہوتے۔

(۱۱) پریشانی و اضطراب کے اس طوفان میں سب سے پہلے حضرت کعب بن مالک نے حضورؐ کو پہچانا۔ اُن کی نگاہ نے خَود میں مستور چہرے کی جزدی جھلک ہی سے پہچان لیا۔ آواز لگائی کہ مسلمانو، بشارت ہو، حضورؐ زندہ ہیں۔ حضورؐ نے اشارے سے کعب کو منع فرمایا مگر یہ خبر پھیلتی گئی۔

(۱۲) بعض واقعات مسلمانوں کے عام شجاعانہ جذبات کے علاوہ محبّتِ رسولؐ اور فداکاری برائے رسولؐ کے آئینہ دار ہیں۔

مسلمانوں میں جب ابتری پھیلی اور حضورؐ چند ساتھیوں کے درمیان اکیلے رہ گئے اور ایسے وقت میں حملہ آوروں نے سخت ریلا کیا تو حضورؐ نے پکارا "کون شخص ہمارے لیے اپنی جان فروخت کرتا ہے" یہ سن کر حضرت زیاد بن سکن پانچ انصار سمیت آئے اور حضورؐ کے

سامنے کھڑے ہو کر دشمن کے وار سہتے اور روکتے ہوئے باری باری جان بحق ہوئے. دم آخر حضرت زیادؓ بن سکن کے خون میں لوٹتے جسم کو اپنے قریب طلب کیا. قریب لائے گئے تو گھسٹ کر اپنا رخسار حضورؐ کے قدموں سے لگا دیا پھر خوشی خوشی جان دے دی. حضرت طلحہؓ کا یہ حال ہوا کہ دشمنوں کے وار روکتے روکتے انگلیاں کٹ گئیں اور ان کے بدن پر ستر زخم لگے. مگر وہ برابر ڈھال بن کر حضورؐ کے سامنے کھڑے رہے. حضرت ابو دجانہ اس موقع پر حضورؐ کے سامنے دشمنوں کی طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہو گئے اور آنے والے تیروں کو اپنی پشت پر روکا. حضرت قتادہ بن نعمان اپنا چہرہ حضورؐ کے چہرے سے ملا کر کھڑے ہو گئے اور ایک تیر ان کی آنکھ میں لگا جس سے آنکھ جاتی رہی. سعد بن ابی وقاص نامور تیر انداز تھے، دشمن پر سخت ناوک اندازی کی. حضورؐ اکرم اپنے ترکش سے تیر نکال نکال کر سعد کو دیتے اور فرماتے "میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں، اے سعد! تیر پھینکو" خود سرکار رسالتمآب نے بھی اپنی کمان نکال کر تیر چلائے، مگر بعد میں کمان کی تانت ٹوٹ گئی.

حضرت امِ عمارہؓ جو بیعت عقبہ میں شریک تھیں، زخمیوں کو پانی پلانے کی خدمت انجام دے رہی تھیں. جب حضورؐ کی طرف دشمنوں کا ریلا دیکھا تو مشک پھینک کر تیر کمان لے کے کھڑی ہو گئیں. تیر چلائے. پھر حضورؐ کے قریب تر جا کر لڑنے کا خیال ہوا. تلوار سنبھالی اور دوڑ کر پہنچیں. بیچ میں ابنِ قمئہ آگیا اور جب اس نے حضورؐ پر وار کیا تو ام عمارہ تڑپ کر اس پر ٹوٹ پڑیں. آخر میں قمئہ بھاگ گیا. اس خاتون کو سر اور گردن پر ۱۳ زخم لگے. حضورؐ نے بشارت دی کہ قیامت کے دن بھی ام عمارہ اسی طرح میرے قریب ہوں گی جیسی میدانِ احد میں.

(۱۳) خواتین کا جذبہ دیکھیے کہ ہند انصاریہ کو پہلے اطلاع ملی کہ تمھارے بھائی شہید ہو گئے، پھر آگے بڑھیں تو بتایا گیا کہ تمھارے والد کو بھی خدا نے بلا لیا، پھر تیسری بات بتائی گئی کہ تمھارے شوہر جنت سدھارے. آفرین ہے اس خاتون پر کہ انھوں نے پورے صبر سے کام لیا اور کسی کے سامنے کسی غم کا اظہار نہیں کیا. آخر پوچھا تو یہ پوچھا کہ کیا خدا کے

رسول صؐ خیریت سے ہیں؟ جب خیریت بتائی گئی تو فرمایا کہ اب اس اطمینان کے بعد ہر مصیبت آسان ہے۔ اسی طرح حمنہ بنتِ جحشؓ کے شوہر، باپ اور ماموں شہید ہو گئے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے ایمان کے بل پر اس سہ گونہ صدمے کو سہ لیا۔ ویسے مدینے میں جب اُحد کی مصیبت کی خبر پہنچی تو حضرت فاطمہؓ سمیت بہت سی خواتین اُحد تک آگئیں اور مدینے کا شاذ ہی کوئی گھر خالی رہ گیا ہو گا جس کا کوئی نہ کوئی شہید نہ ہوا ہو۔

(۱۴) دونوں فریقوں کے اخلاقی تقابل کی بڑی اہمیت ہے۔ ادھر سے حضرت ابو دجانہؓ کا یہ کردار تھا کہ اُٹھی ہوئی تلوار ہند زوجۂ سفیان کے سر کے اُوپر ہی اُوپر یہ کہہ کر روک لی کہ یہ رسول اللہ کی تلوار ہے اسے میں کسی عورت کے خُون سے آلودہ نہیں کروں گا۔ دوسری طرف حضرت حمزہؓ پر حملہ کرنے والا حبشی غلام وحشی پتھر کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھتا ہے اور بزدلانہ انداز سے خفیہ ناگہانی حملہ کرتا ہے۔

دوسرا فرق وہ ہے کہ زوجۂ ابوسفیان اور بعض دوسرے مشرک مردوں اور عورتوں نے مسلمان شہداء کے لاشوں کو بگاڑا، یہاں تک کہ حضرت حمزہؓ کے جسد کا جو حال کیا گیا تھا اُسے دیکھ کر تو حضورؐ میں بھی اس جذبے نے کروٹ لی کہ اگر ہمیں موقع ملے تو ہم بھی ایسا ہی کریں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے انتباہ ہوا اور آپؐ نے مسلمانوں کو اس بات سے منع کر دیا کہ دشمن کی لاشوں کو بگاڑا جائے۔ اس فرمان کا اثر آج تک موجود ہے۔

(۱۵) ادھر ابو عامر کا جو کردار بیان ہوا، اس کے مقابلے میں دوسرا کردار بھی دیکھیے۔ یہ صاحب اُصَیرِم نام کے تھے اور یہود کے گروہ سے وابستہ چلے آرہے تھے۔ مگر مزاجاً نیک سرشت تھے اور یہودیوں کو اکثر یہ احساس دلاتے رہتے کہ مشرکوں کے مقابلے میں تمہیں معاہدے کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرنی چاہیے۔ یہ کھجوریں کھاتے کھاتے میدانِ اُحد کی طرف سے گزرے تو پہلے تو یہ سماں دیکھنے کے لیے آگے بڑھے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دو بدو دریافت کیا کہ میں اگر یہاں لڑوں اور مارا جاؤں تو مجھے کیا ملے گا؟ حضورؐ نے فرمایا۔ "جنت!" اور وہ شخص تلوار لے کر یہ کہتا ہوا بے جگری سے دشمن پر ٹوٹ پڑا کہ اگر میں نے اپنی بقیہ کھجوریں کھانے کی مہلت پالی تو گویا بڑی مہلت ہو گی۔ خدا کا کرم کہ وہ شخص شہید

ہوا اور حضورؐ کی بشارت پوری ہوئی۔ یہ ایک ایسے صحابی کی مثال ہے جس نے نہ کوئی نماز پڑھی، نہ روزہ رکھا، سیدھا جنّت میں جا پہنچا۔

(۱۶) بلاشبہ بعض غلطیوں کی وجہ سے مسلمانوں کے ہاتھوں سے حاصل شدہ فتح چھن گئی، مگر یہ شکست بھی نہیں تھی، کیونکہ وہ میدان ہی میں تھے کہ ابوسفیان اپنی فوج کو لے کر چلا گیا۔ وہ بھی خوب سمجھتا تھا کہ یہ صورتِ حالات اتفاقی ہے۔ پھر جب مقام روحا میں جا کر سردارانِ قریش نے از سرِ نو معاملے کو سوچا تو ایک جوشیلی رائے یہ تھی کہ ہمیں واپس جا کر مدینے پر اچانک حملہ کرنا چاہیے، لیکن صفوان بن اُمیّہ کی رائے اس کے خلاف تھی۔ وہ کہتا تھا کہ اصحابِ محمدؐ اس وقت جوشِ جہاد سے بھرے ہوئے ہیں، ممکن ہے کہ دوسرے حملے میں ہمیں کامیابی نہ ہو۔ اُدھر قریش کو مَعبد خزاعی کے ذریعے یہ اطلاع ملی کہ نبی اکرمؐ تمھارے تعاقب میں نکلے ہیں اور حمراء الاسد تک آگئے ہیں۔ اس پر ابوسفیان نے لشکر کو مکّے کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ جنگی لحاظ سے حضورؐ کی تدبیرِ تعاقب مسلمانوں کی کمزوری کے تصوّر کا مغالطہ دُور کرنے کا ذریعہ بنی۔

غزوۂ اُحد کے ان چند اسباق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس معرکے کو اُس انقلابی جدوجہد میں کیا اہمیّت حاصل تھی جو حضورؐ کی رہنمائی میں جاری ہوئی۔ غزوۂ اُحد محمدیؐ انقلاب کی تاریخ کا بہت اہم باب ہے جس میں محسنِ انسانیت کی شخصیت اور تعلیم کا حُسن جھلملاتا ہے۔

تقریر ۱۹

غزوۂ اُحد کے بعد کے احوال

غزوۂ اُحد کے بعد قدرتی بات تھی کہ فتحِ بدر کے اثرات میں کسی قدر کمی آئی، اور بعض قدامت پسند قبائل ایک بار پھر قریش سے وابستہ ہونے لگے۔ جرائم پیشہ اور شرپسند عناصر میں سرکشی اٹھنے لگی۔ اُحد کے بعد کے حالات کی پیچیدگی سے مدینہ اس وجہ سے بخوبی عہدہ برا ہو سکا کہ مسلم جماعت چاق و چوبند اور اس کی قیادت بڑی مضبوط تھی۔ ہر شرارت کی جرأت سے سرکوبی کر کے لا اینڈ آرڈر کو بحال رکھا گیا۔

سب سے پہلے خویلد کے بیٹوں طلحہ اور سلمہ نے اُسَد بن خُزیمہ کو مدینے پر ڈاکہ زنی کے لیے تیار کیا۔ محرم ۴ھ کا چاند ہوتے ہی اطلاع ملی۔ حضورؐ نے ابو سلمہ مخزومی کی سرکردگی میں ڈیڑھ سو افراد کا دستہ بھیجا۔ شرپسند فرار ہو گئے۔ ان کے پیچھے مویشیوں کا گلہ رہ گیا، وہ بحقِ حکومت اسلام ضبط کر لیا گیا۔ ۵ محرم کو خبر پہنچی کہ خالد ابنِ سفیان ہُذَلی نے جمعیت اکٹھی کی ہے۔ مدینے کی ہائی کمان نے عبداللہ بن انیس جہنی انصاری کو مہم پہ بھیجا۔ وہ شرپسندوں کے سرغنہ کا سر کاٹ لائے۔

دو تین مہینوں کے بعد ایک خوف ناک حادثہ پیش آیا۔ ماہ صفر کے آغاز میں قبیلہ عضل و

قبیلۂ قارہ کے لوگ سازش کر کے مدینے آئے اور حضورؐ سے درخواست کی کہ ہمارے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے ہیں اُن کی تعلیم و تربیت کے لیے اپنے معلمین بھیجیے۔ دس اہلِ علم کا وفد روانہ کیا گیا۔ امیر مرثد بن ابی مرثد مقرر ہوئے۔ مقام رجیع پر پہنچ کر سازشیوں نے حضرت خبیب اور حضرت زیدؓ الدثنہ کو چھوڑ کر باقی سب کو تہِ تیغ کر دیا۔ ان دونوں کو قریشِ مکّہ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ جنھوں نے اُنھیں اپنا انتقام ٹھنڈا کرنے کے لیے قتل کر دیا۔

کتنا دردناک واقعہ ہے کہ قلیل التعداد مسلم جماعت میں سے حضورؐ چند قیمتی افراد کو تعلیمی مشن پر بھجواتے ہیں جو بلا کسی معاوضے کے علم کی شعاعیں پھیلانا چاہتے تھے۔ ان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ حضورؐ کو کتنا صدمہ ہوا ہو گا۔

اب ذرا دوسری طرف توجہ کیجیے! مکّہ کی قیادت نے پہلے حضرت زیدؓ کو تنعیم کے میدان میں قتل کر دیا۔ قتل سے پہلے ابوسفیان نے ان سے پوچھا کہ "اے زیدؓ کیا تم اس بات کو پسند کرو گے کہ تم کو چھوڑ دیا جائے اور تم اہل و عیال میں ہنسی خوشی رہو بسو، اور تمھاری جگہ محمدؐ کی گردن مار دی جائے۔" عاشقِ رسولؐ نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ "بخدا ہمیں تو یہ بھی پسند نہیں کہ ہماری زندگی اور آزادی کے بدلے میں حضورؐ کو ایک کانٹا بھی چبھے۔" یہ سُن کر ابوسفیان نے کہا! "میں نے کسی کو کسی کا ایسا محب نہیں پایا جیسا کہ محمدؐ کو اصحابِؓ محمد محبوب رکھتے ہیں۔" کسے معلوم کہ حضرت زید کے اس جملے نے اور کتنے دلوں پر کیا اثر کیا ہو گا۔

حضرت خباب کو سولی پر چڑھایا گیا۔ اس مردِ خدا نے اِس سے قبل دو رکعت نماز ادا کرنے کی اجازت مانگی جو دی گئی۔ ان کی یہ دو رکعت کی نماز بعد کی ساری تاریخ میں مقتولینِ مظلوم کے لیے سُنت بن گئی۔

ابھی حادثۂ رجیع کا زخم تازہ ہی تھا کہ علاقۂ نجد سے ابو براء ابنِ مالک مدینے آیا۔ اُس نے بڑے ہی مخلصانہ انداز میں مشورہ دیا کہ آپ اپنے رفقا کو علاقہ نجد میں دعوت و تعلیم کے لیے روانہ فرمائیں۔ اُمید ہے کہ لوگ قبول کریں گے۔ چونکہ بہت وجوہ سے اس علاقے میں دعوت کا پھیلنا مطلوب تھا، اس لیے حضورؐ نے ۷۰ قیمتی اشخاص کی ایک جمیعت روانہ کی۔ ان میں اوّل درجے کے قاری، مفسر، فقیہہ، معلّم اور داعی شامل تھے۔ اتنی بڑی جماعت

علاقے اور آبادی کی مناسبت سے بھیجی گئی تھی۔ تفصیلات سے قطعِ نظر، یہ دعوتی و تعلیمی وفد جب بیرِمعونہ کے مقام پر پہنچا تو بنی اسلیم کے ذیلی قبائل نے اپنے سرداروں کے حکم سے اس پر حملہ کرکے ۶۹ افراد کو شہید کر دیا۔ سترویں رکنِ وفد جناب کعب بن زید تھے، جو لاشوں کے اندر اس طرح لہولہان پڑے تھے کہ حملہ آور ان کو مردہ سمجھ کر چلے گئے۔ انھیں ہوش آئی تو یہ اٹھے اور مدینے روانہ ہو گئے۔

حضورؐ کا قلبِ حساس اس واقعے سے بہت دُکھا۔ مسلم جماعت پہلے ہی کثیر التعداد نہ تھی۔ یہ کمی بڑے نقصان کا باعث تھی اور پھر رضا کار معلّمین کی مظلومانہ شہادت، جس کے لیے دھوکا کیا گیا تھا، مزید رنجیدہ تھی۔ آپ نے مجروح دل کے ساتھ ایک مہینے تک نمازِ فجر میں اپنے معلّمین کے قاتلوں کے لیے بددُعا کی۔ اس بددُعا کا اصطلاحی نام قنوتِ نازلہ ہے۔

یہ بددُعا کا صرف ایک بڑا واقعہ حضورؐ کی زندگی میں نمایاں ہے، مگر اس سے بھی خداوندِ عرش وفرش نے حضورؐ کو روک دیا۔ دُعا و بددُعا کو قبول کرنا نہ کرنا تو خدا کے اختیار میں ہے ہی، اس نے بددُعا کرنے تک کی ممانعت کر دی۔ مصلحتِ خداوندی یہ بھی تو تھی کہ آگے چل کر ان قبائل میں اسلام کو پھیلنا تھا۔

ان جگر خراش واقعات کی زد میں آکر بھی نہ حضورؐ گھبرائے، نہ مایوس و بددل ہوئے، نہ دین و سیاست کی ضروری کارروائیوں میں فرق آنے دیا۔

اِدھر خود مدینے کے اندر بھی شر انگیز عناصر موجود تھے جو اپنی دولت، زمینوں اور قلعہ بندیوں کے بل پر دم خم رکھتے تھے۔ حضورؐ کی مخالفت کرنے والوں میں بنو نضیر کا گڑھ بڑا مضبوط تھا۔ بنو نضیر کی اب تک کی حرکاتِ شنیعہ میں آخری چیز حضورؐ کو قتل کرنے کی کوشش تھی۔ اس صریحی غدارانہ فعل پر حضورؐ نے معاہدۂ مدینہ کے پیشِ نظر بنو نضیر کی شہریت سلب کرنے کا نوٹس دے دیا کہ وہ دس روز کے اندر اندر مدینے سے پُرامن طریق سے چلے جائیں۔ لیکن بنو نضیر کو عبداللہ بن ابیّ نے نجانے کہاں سے بھاری فوجی مدد دلانے کا وعدہ کر کے بھڑکایا۔ انھوں نے حضورؐ کو چیلنج کے طور پر کہلوایا کہ ہم نوٹس کی تعمیل نہیں کرتے، آگے آپ جو چاہیں کریں۔ حالات کی اس پیچیدگی کی بنا پر ربیع الاوّل ۴ھ میں حضورؐ نے فوج لے کر اقدام

کیا اور بنو نضیر کا محاصرہ کر لیا۔ کوئی مدد کو نہ آیا۔ آخر بے بس ہو کر انھوں نے بستی خالی کر دی۔ اور خیبر چلے گئے۔ حضورؐ کی کریمانہ شان اس سے ظاہر تھی کہ وہ لوگ نہ صرف جانیں بچا کر لے گئے بلکہ اونٹوں پر اپنے قیمتی اموال کے علاوہ دروازوں کے کواڑ تک اکھیڑ کر لے گئے۔ کھچاؤ اور ٹکراؤ کے اس ماحول میں بھی بنو نضیر کے اندر سے دو سعید روحیں ایسی نکلیں جنھوں نے سچائی کی روشنی کو پہچانا اور حضورؐ کے ہاتھ پر ایمان لائے۔ یہ تھے یامین بن عُمیر اور ابو سعید بن وہب۔

غزوہ بنو نضیر کے بعد کچھ دن حضورؐ نے مدینے ہی میں قیام رکھا۔ اوائلِ جمادی الاوّل میں رپورٹ آئی کہ بنو غطفان کے قبائل بنی مُحارب اور بنی ثعلبہ حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔ حضورؐ نے فوراً چند سو صحابہ کے ساتھ مارچ کیا۔ نجد پہنچنے پر دشمن سامنے آیا تو ضرور، مگر جنگ نہیں چھڑی۔ اتنے ہی میں معاملہ ختم ہو گیا۔

حضورؐ کی قائدانہ اور عسکری حکمتِ عملی کا یہ شاندار نمونہ ہے کہ مشکل حالات میں بھی آپؐ نے ہر چھوٹے سے چھوٹے چیلنج پر حرکت واقدام کیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ شر پسند قوتوں نے سر اٹھاتے ہی اپنے آپ کو سمیٹ لیا۔ اگر ان کو ذرا ڈھیل ملتی تو پھر چوطرفہ سیلاب بلا کو روکنا مشکل ہو جاتا۔

ابو سفیان اُحد کے میدان سے یہ چیلنج دے کر رخصت ہوا تھا کہ ہمارا تمھارا آئندہ مقابلہ اگلے سال میدانِ بدر میں ہوگا۔ یہ بات اس نے کہہ تو دی تھی مگر بعد میں اسے اندیشوں نے گھیر لیا، اور وہ دل سے چاہتا تھا کہ اگلے سال مسلم قوت بدر میں نہ آئے، اور وہ ایک چکر اُدھر کا لگا کر کہہ سکے کہ کوئی مقابلے کو آیا ہی نہیں۔ ستم یہ کہ نعیم بن مسعود کو مدینے روانہ ہوتے ہوئے اس نے کچھ مال دے کر یہ کہا کہ وہاں جا کر یہ مشہور کرو کہ اہل مکہ بڑی بھاری فوجی قوت لا رہے ہیں۔ نیز مسلمانوں کو مشورہ دو کہ تم قریش سے لڑنے کے لیے نہ نکلو۔ پروپیگنڈے کے اس حربے کا نتیجہ اُلٹا نکلا۔ مسلم جماعت کے جوشِ ایمانی میں اضافہ ہو گیا۔ ساری انسانیت کا معلّم تہذیب پندرہ سو جانبازانِ حق کے ساتھ مدینے سے نکلا۔ رایتِ اسلام حضرت علیؓ کے ہاتھ میں تھا۔ دوسری طرف سے ابوسفیان دو ہزار افراد کا لشکر ساتھ لایا۔ مگر مقام ظہران یا عسفان سے خشک سالی کا بہانہ کر کے واپس چلا گیا۔

حضورؐ آٹھ روز تک بدر میں کیمپ لگائے دشمن فوج کا انتظار کرتے رہے۔ اب سولے

اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ آپؐ اپنی فوج کو لے کر مدینہ واپس آ گئے۔

یہ فوجی کارروائیاں تو ایک مجبورانہ نوعیت رکھتی تھیں کہ ان کے بغیر نوخیز اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرہ کی بقا ہی ممکن نہ تھی۔ مگر دوسری طرف تعمیری و اصلاحی کاموں کا سلسلہ اپنی جگہ جاری تھا۔

چنانچہ شمشیر و سناں کی کھیل کے درمیان ہی حرمت شراب کا حکم نازل ہوا۔

شراب نوشی، اسلامی تحریک کے معیارِ کردار کے ساتھ چل نہیں سکتی تھی۔ ابتداءً سورۃ بقرہ کی ایک آیت میں شراب اور جوئے کے متعلق یہ اشارہ ہو چکا تھا کہ اِن کے فائدے سے ان کا گناہ زیادہ بڑا ہے۔ بعض صحابہؓ نے اسی اشارے کو سمجھ کر شراب ترک کر دی۔

پھر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے دوستوں کی دعوت کی، کھانے کے بعد شراب کا دور چلا، بعد ازاں نمازِ مغرب کا وقت ہو گیا، ایک صاحب کو جماعت کا امام بنایا گیا، وہ سورۃ کافرون غلط پڑھ گئے۔ اس واقعہ کے پس منظر کے ساتھ حکم آیا کہ نشے کی حالت میں نماز کے لیے نہ کھڑے ہو۔ یعنی نماز کے اوقات سے متصل شراب نہ پی جائے۔

پھر ایک اور واقعہ پیش آیا۔ حضرت عُتبان بن مالک کے گھر میں دعوت تھی۔ پہلے کھانا ہوا، پھر شراب کا دور چلا، پھر شعر و شاعری میں مفاخرت ہونے لگی، نشے کی حالت میں سعد بن ابی وقاص نے ایک قصیدہ پڑھا جس میں اپنی قوم کی تعریف کے ساتھ انصارِ مدینہ کی ہجو بھی کی گئی تھی۔ اس پر ایک انصاری نوجوان نے مشتعل ہو کر اُونٹ کے جبڑے کی ہڈی حضرت سعد کے سر پر دے ماری۔ وہ شدید زخمی ہو گئے۔ حضرت سعد نے حضورؐ کے سامنے شکایت کی۔ شکایت سُن کر حضورؐ نے دُعا کی: "یا اللہ شراب کے بارے میں ہمیں کوئی واضح اور قطعی حکم و قانون عطا فرما"۔

کسی بھی حکم و قانون کے اجراء سے قبل اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ بعض واقعات سے ایسا ماحول پیدا ہو جائے کہ مسلم سوسائٹی ایسے حکم کی خود ضرورت محسوس کرنے لگے، یا حکم کی مصلحت آسانی سے سمجھ سکے۔ اسی کو شانِ نزول کہتے ہیں۔

سو حضورؐ کی دُعا کے جواب میں حرمتِ شراب کا قطعی حکم آ گیا۔ شراب اور جوئے

اور استھانوں کے چڑھاووں اور پانسے کے تیروں کو یکبارگی " رجسٌ من عمل الشیطٰن"
کہا گیا۔ "یعنی گندے شیطانی کام" اور بتایا گیا کہ ان کے ذریعے شیطان تمھارے درمیان جھگڑا
فساد پیدا کرتا ہے اور خدا کے ذکر اور نماز کو خراب کرتا ہے۔ آخری جملہ تھا: فھل انتم منتھون۔
پھر کیا تم باز آؤ گے؟

یہ آیت سُن کر بعض صحابہ نے چلّا کر کہا: "خداوندا! ہم باز آ گئے"۔ یہ ہے کسی بھی صاحبِ
ایمان کی شان کہ خدا کی طرف سے جو امرِ الٰہی بھی اسے پہنچے اس پر سرِ تسلیم خم کر دے۔

اُسی وقت شراب کی حُرمت کی منادی کرائی گئی۔ حضرت ابوطلحہ کے گھر میں شراب کا
دور چل رہا تھا۔ جونہی منادی کی آواز پہنچی، جام ہاتھوں سے الگ کر کے پھینک دیے گئے،
اور مٹکے گلی میں لنڈھا دیے گئے۔

مدینے کے مسلمان ایسے نہ تھے کہ اِدھر تو خدا پر ایمان لائیں اور رسولؐ کے ہاتھ پر
بیعت کریں اور قرآن کو قندیلِ ہدایت مانیں اور اُدھر جو حکم دیا جائے، اسے بالائے طاق
رکھ کر اپنی روش میں مگن رہیں۔ جو کوئی رسولؐ اللہ کی رسالت اور قیادت کو قبول کرتا ہے، وہ
اگر حضورؐ کی لائی ہوئی ہدایت کی پیروی نہیں کرتا تو اس کی شخصیت میں کھوٹ موجود ہے۔

اب ذرا ایک طرف مدینے کے اس قانونِ امتناعِ شراب کی تعمیل کا عالم دیکھیے اور
دوسری طرف دورِ جدید کی ایک بڑی مہذب ریاست امریکہ کے قانونِ امتناعِ شراب کے
تجربے کا جائزہ لیجیے۔ اس قانون کی امریکہ میں اتنے بڑے پیمانے پر خلاف ورزی کی گئی کہ
اس کی دھجیاں اُڑ گئیں اور شراب اور دیگر اشیا کا اتنا زور رہا کہ یہ چیزیں لازمۂ تہذیب
بن گئیں۔ ∞

تقریر ۲۰

غزوۂ بنو مُصطَلَق

۵ھ کا اہم جنگی واقعہ بنو مصطلق کے خلاف کارروائی کا ہے۔ یہ بہت بڑا جنگجو قبیلہ تھا۔ اطلاع ملی کہ یہ لوگ شرانگیزی کے لیے پَر تول رہے ہیں۔ بُریدہ اسلمی کو بھیج کر حضورؐ نے تحقیقات کرائی تو خبر کی تصدیق ہوئی۔ ۲ شعبان کو حضورؐ فوج لے کر روانہ ہوگئے۔ نہایت تیز رفتاری سے مُرَیسیع کے مقام پر جا پہنچے۔ دشمن آمادۂ جنگ تھا، مگر حضورؐ کے اچانک آپہنچنے کی وجہ سے بیشتر مخالف سپاہ بکھر گئی۔ صرف قبیلہ کے اپنے لوگ باقی رہے۔ پہلے ہی ہلے میں قبیلہ کو شکست ہوگئی۔ بکثرت مویشی مالِ غنیمت میں آئے اور قبیلے کے سارے لوگ جنگی قیدی بنا لیے گئے۔ انھی لوگوں میں جُوَیریہ بھی تھیں جنھوں نے کلمۂ حق پکار کر کہا کہ میں اسلام لاکر حاضر ہوئی ہوں۔ حضورؐ نے ان کی رضامندی سے انھیں اپنے حرم میں لے لیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں نے بنو مصطلق کے تمام قیدیوں کو اس بنا پر رہا کر دیا کہ رسول اللہ کے قرابت داروں کو اب ہم اسیر نہیں رکھ سکتے۔ جویریہ سردارِ قبیلہ حارث کی بیٹی تھیں۔

مسلمانوں کو یہاں جو فتح ایک بڑی طاقت کے مقابلے میں نہایت آسانی سے حاصل ہوئی، اس پر منافقین جل بھن گئے۔ پہلے انھوں نے پانی کے چشمے پر مہاجرین و انصار

میں جھگڑا پیدا کرایا۔ خود رسولِ خدا نے بر وقت مداخلت کر کے حکمت کے ساتھ اس آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔ مگر منافقین راستے بھر دونوں گروہوں کے درمیان ریشہ دوانیاں کرتے رہے۔

اس سفر کا سب سے بڑا واقعہ حضرت سیدہ عائشہ پر ایک گندا بہتان لگانے کا ہے، جس کی ذمہ داری منافقین ہی پر تھی۔

انسانی خیر و فلاح اور تعمیر اخلاق کے پروگرام کے ساتھ جو تحریکیں نمودار ہوتی ہیں، طرح طرح کے اشرار اور نفس پرست اور گروہ پرست معاند اُن کے گرد تاک لگائے بیٹھے ہوتے ہیں کہ کب کدھر سے کوئی شرارت اُٹھائی جا سکتی ہے۔ نیز ایسی تحریکوں کے لیے تیغ و سناں کی جنگیں اتنی بھاری نہیں ہوتیں، جتنا کہ اخلاقی پہلو سے ان پر حملہ!

امرِ واقعہ صرف اتنا تھا کہ غزوۂ بنو مصطلق سے واپسی پر ایک جگہ لشکر نے پڑاؤ کیا۔ ام المومنین حضرت عائشہ ضرورت سے ایک طرف کو تھوڑی دور چلی گئیں، اور بعض روایات کے مطابق وہاں ان کا ہار گر گیا اور ریت میں اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے کچھ دیر ہو گئی۔ اِدھر قافلے کے کوچ کا حکم ہوا، لوگ آئے اور حضرت عائشہ کے خالی کجاوے کو جس پر پردہ تھا، اُٹھا کے اُونٹ پر رکھ دیا۔ سیدہ عائشہ چونکہ بہت دبلی تھیں، اس لیے وہ جلدی میں یہ محسوس نہ کر سکے کہ اس کے اندر وہ تشریف فرما نہیں ہیں۔ وہ نگاہیں پھیرے ہوئے تھے اس وجہ سے کوئی جھلک دیکھنے نہ دیکھنے کا سوال ہی نہ تھا۔

ام المومنین حضرت عائشہ جب پلٹ کر اپنی جگہ پہنچیں تو قافلہ دور جا چکا تھا کوئی تدبیر نہ سوجھی تو ریت پر چادر تان کر لیٹ گئیں اور گہری نیند طاری ہو گئی۔ لشکر کے پیچھے کچھ لوگ چلا کرتے تھے تاکہ کوئی چیز رہ جائے تو سنبھال لیں۔ ابکی یہ ڈیوٹی صفوان بن معطل کی تھی۔ ذرا دور سے اُنھوں نے ایک ہیولیٰ دیکھا تو اُدھر آ گئے۔ حضرت صفوان چونکہ حکم حجاب سے پہلے حضرت عائشہ کو دیکھ چکے تھے، اس لیے پہچان کر اُنھوں نے انا للّٰہ و انا الیہ راجعون، پڑھا۔ یہ آواز سُن کر حضرت عائشؓ کی آنکھ کھل گئی اور اُنھوں نے چادر مُنہ پہ ڈال لی۔ صفوان نے اُونٹ کو بٹھایا اور مُنہ ایک طرف کر کے کہا کہ آپ سوار ہو جایئے۔

دوپہر کو لشکر نے پھر پڑاؤ کیا اور تھوڑی دیر میں کڑکتی دھوپ میں صفوان نے حضرت عائشہ رضؓ کو کیمپ میں پہنچایا۔

بس اس پر منافقین نے اس سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ ام المؤمنین سیدہ عائشہ کس ہستی کی رفیقہ اور کس بزرگ کی صاحبزادی ہیں، ان کا گھرانا کیسا ہے، وہ کس دین پر کاربند اور کس جماعت سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کو لانے والا صفوان خدا کے رسولؐ اور ان کے حرم کے متعلق کیا عقیدت رکھتا ہے، چہ میگوئیوں کا طوفان اُٹھا دیا۔ یہ گندے لوگ کہنے لگے کہ "کیسے ممکن ہے کہ یہ بچ کر آئی ہوں" اور یہ کہ "ذرا دیکھیے تو سہی کہ بنے ہوئے ہیں داعئ حق اور ساری انسانیت کی اصلاح کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اور اپنا یہ حال ہے"

سیدہ عائشہ رضؓ کو جن کی طرف قرآن نے "پاک دامن، بھولی بھالی اور مومن خواتین" کے الفاظ سے اشارہ کیا ہے، ایسی کسی بات کی خبر نہ تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔

ان کا اپنا بیان ہے کہ مدینے پہنچ کر میں بیمار ہو گئی اور ایک مہینے تک صاحبِ فراش رہی۔ مجھے اور کسی بات کا علم نہ تھا، صرف یہ دیکھتی تھی کہ رسول اللہؐ کی ویسی توجہ میری طرف نہ تھی جیسی بیماری کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ بس جب تشریف لاتے تو سرسری طور سے پوچھ لیتے کیفَ تیکم ؟ (کیسی ہیں یہ ؟) اس زمانے میں گھروں میں بیت الخلاء نہ تھے، ہم لوگ شہر سے باہر جنگل جایا کرتے تھے۔ میرے والد کی خالہ زاد بہن میرے ساتھ تھیں۔ راستے میں ان کو ٹھوکر لگی تو اُنھوں نے بیٹے کا نام لے کر کہا کہ بُرا ہو مسطح کا! میں نے کہا، تم ماں ہو کر بیٹے کو کوستی ہو۔ پھر اُنھوں نے سارا قصہ سُنایا کہ مسطح بن اثاثہ اور دوسرے لوگ میرے بارے میں کیا گندگی پھیلا رہے ہیں۔ یہ سُن کر میرا خون خشک ہو گیا اور وہ حاجت ہی بھول گئی جس کے لیے نکلی تھی۔ سیدھی گھر واپس آ گئی اور رات بھر رو رو کر کاٹی۔ رونے کا یہ عالم رہا کہ اندیشہ ہوا کہ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا"

خیر یہ قصہ بہت بڑا قصہ ہے۔ اس کا اختتام اس پر ہوا کہ حضرت عائشہ رضؓ کی پاک دامنی کی شہادت عرش سے آئی اور سورۂ نور کی شعاعوں نے ظلمتوں کو پارہ پارہ کر دیا۔ حضرت مریم کے بعد یہ دوسری خاتون ہیں جن کی عصمت و عفت کی تصدیق خود اللہ تعالیٰ نے کی۔

حضرت عائشہؓ کا تذکرہ الکتاب میں شامل ہو گیا۔ حضرت عائشہ کی براءت کی وحی آنے پر ان کی والدہ نے جب کہا کہ اُٹھو اور رسولؐ اللہ کا شکریہ ادا کرو، تو حضرت عائشہ نے جواب دیا کہ میں نہ ان کا شکریہ ادا کروں گی، نہ آپ دونوں کا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر کرتی ہوں جس نے میری براءت نازل فرمائی۔ آپ لوگوں نے تو بہتان کا انکار تک نہ کیا۔

پھر زنا اور اس کی تہمت اور معاشرتی زندگی کے متعلق دوسرے اہم قوانین نازل اور نافذ ہوئے۔ اور بلا ثبوت بہتان لگا کر پروپیگنڈا کرنے والے چند حضرات کی پیٹھوں پر قانون کے تازیانے برس گئے۔

تقریر ۲۱

غزوۂ خندق یا جنگِ احزاب

ان حالات سے گزر کر ہم پھر قریش کے پروگرام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ قریش اور مدینے کی مسلم قوت میں ایک بڑا فرق تھا۔ اُدھر نظامِ جاہلیت کی روح جامد اور مضمحل تھی اور اس سوسائٹی کا کوئی نہ کوئی جز ہر آن کٹ کر مدینے کی جھولی میں گر رہا تھا۔ مدینے کی مسلم طاقت مثبت، اصولی، نظریاتی، دعوتی اور عوامی طاقت تھی، لہٰذا وہ متحرک تھی، فعال تھی، سرگرم تھی اور برابر نشو و نما پا رہی تھی۔ پس وقت کا گزرنا مدینے کے لیے مفید اور مکّے کیلئے نقصان دہ تھا۔ اب اُنھیں مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے پہلے سے بڑی قوت کی ضرورت تھی۔ قریش، یہود، احابیش، بنو غطفان مل کر جلد سے جلد اس قوت کو تیار کرنا چاہتے تھے؛ چنانچہ سب نے مل جل کر ایک منصوبہ بنایا۔

آخر تقریباً دس ہزار سپاہ پر مشتمل لشکر مدینے پر حملے کے لیے تیار ہو گیا۔ حضورؐ کو اطلاع مل چکی تھی۔ مشاورت منعقد ہوئی۔ فیصلہ ہوا کہ مدینے میں رہ کر ہی مدافعت کی جائے۔ حضرت سلمان فارسی کا یہ مشورہ قبول کیا گیا کہ مدینے کے شمالی کھلے حصے کی طرف خندق کھود دی جائے۔ تین ہزار مسلم سپاہی خندق کھودنے میں مصروف ہو گئے۔ دس دس آدمیوں کی ٹولیاں بنائی

گئیں اور ہر ٹولی کو تقریباً ۴۰ گز لمبا ٹکڑا سونپا گیا۔ طول ۳½ میل تھا۔ اندازاً چوڑائی اور گہرائی اگر ۵، ۵ گز سمجھی جائے تو تقریباً ۱۴ لاکھ چھیاسی ہزار مکعب فٹ مٹی کو کھودنا اور منتقل کرنا تھا۔ فی کس ۴۶۲ مکعب فٹ سے کچھ زیادہ مٹی آتی تھی۔ ٹوکریاں کم تھیں لہٰذا ابوبکرؓ و عمرؓ جیسی ہستیاں چادروں اور دامنوں میں بھر بھر کر مٹی اُٹھاتی تھیں۔

اِدھر خندق کی تکمیل ہوئی اور اُدھر شوال ۵ھ میں اسلامی ریاست کے متحدہ دشمنوں کی ٹڈی دل افواج مدینے آ پہنچیں۔ مگر خندق کا معاملہ ان کے لیے نیا تھا۔ کچھ لوگوں نے گھوڑے دوڑا کر اسے پار کرنا چاہا، مگر اندر گر کر ختم ہو گئے۔ صرف ایک بار ایسا ہوا کہ ایک مناسب مقام تلاش کر کے قریش کا نامی شہسوار عمرو بن عبدِ وُدّ کچھ اور سواروں کے ساتھ خندق کے اس پار آ گیا۔ آتے ہی اس نے للکارا، حضرت علیؓ جیسا پیکرِ شجاعت مقابلے میں آیا۔ اُنھوں نے حریف کا کام تمام کر دیا۔ اس طرح کی کچھ ٹولیوں سے جا بجا اُس دن جنگ ہوتی رہی۔ دشمن نے مسلمانوں کو اتنا مصروف رکھا کہ چار نمازیں قضا ہو گئیں۔ لیکن ایسی جھڑپوں سے جنگ کا فیصلہ تو نہیں ہو سکتا۔

آخر قریش نے ایک شاطرانہ چال سوچی اور بنو قریظہ کو اس پر آمادہ کرنا چاہا کہ وہ مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کر دیں اور لیت و لعل کے بعد بنو قریظہ نے ہاں کر دی۔ بنو قریظہ کے پاس ۱½ ہزار مردانِ جنگی تھے۔

پیغمبرؐ برحق نے اس پیچیدگی کے پیشِ نظر اوس و خزرج کے سرداروں سے بات کی کہ اگر آپ پسند کریں تو بنو غطفان سے مدینے کی ایک تہائی پیداوار پر سمجھوتہ کر لیا جائے۔ سردارانِ انصار نے کہا کہ جب ہم کفر کی حالت میں تھے تو یہ قبائل ہمارا مال نہ لے سکے، آج مسلمان ہو کر ہم ان کو کیسے اپنی دولت سونپ سکتے ہیں۔

اس موقع پر نُعیم بن مسعود نے حضورؐ کے سامنے اپنے اسلام کا اعلان کیا اور پھر اجازت طلب کی کہ میں قریش اور بنو قریظہ میں پھوٹ ڈلوا سکتا ہوں، کیونکہ ابھی تک ان کو میرے اسلام لانے کا علم نہیں۔ حضورؐ نے اجازت دی۔ نُعیم کامیاب ہو گئے، اور دو دشمن طاقتوں میں پھوٹ پڑ گئی۔

دُشمن ایک مہینے سے مدینے کا محاصرہ کیے پڑا تھا۔ سپاہیوں کا محاذ پر جا کر خالی بیٹھنا مشکل ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ رسد کا مسئلہ مشکل تر ہو رہا تھا۔ ان کی رسد کی ایک کھیپ راستے میں ایک مسلم فوجی دستے نے قبضے میں کر لی۔ پھر موسم ناساز گار ہو گیا۔ سردی ناقابلِ برداشت ہو گئی اور ایک رات بہت سخت آندھی چلی۔ حملہ آوروں کے خیمے اکھڑ گئے۔ ہانڈیاں اُلٹ گئیں، جانور بھاگنے لگے۔ حواس باختگی چھا گئی اور فوجوں کے دل بادل آناً فاناً چھٹ گئے۔ سب کوچ کر گئے، صُبح کو میدان میں ہُو کا عالم طاری تھا۔

اس موقع پر مدینہ میں مسلمانوں کے پاس سامانِ خوراک کی کمی تھی۔ چنانچہ لوگ پیٹ پر پتھر باندھ کر کام کرتے تھے اور حضورؐ نے دو پتھر باندھے۔ مسلم جماعت اور اسلامی ریاست کا سربراہ عام مسلمانوں کے ساتھ ہر تکلیف میں شریک تھا۔

اس موقع کا خاص واقعہ یہ ہے کہ خندق کی کھدائی میں حضورؐ نے بھی شرکت کی۔ خاص طور سے جب کوئی مشکل مرحلہ آتا تو حضورؐ کو بلایا جاتا۔ حضرت سلمان کا بیان ہے کہ ایک چٹان ایسی آگئی جو مجھ سے ٹوٹتی نہ تھی۔ رسولِ خداؐ قریب ہی تھے۔ اُنھوں نے مجھ سے کدال لے کر اسے توڑا۔ پہلی ضرب لگائی تو فرمایا کہ یمن میرے لیے فتح ہوا۔ دوسری ضرب پر فرمایا کہ شام اور المغرب میرے سامنے سرنگوں ہو گئے۔ تیسری بار فرمایا کہ خطۂ مشرق (یعنی ایران) مفتوح ہوا۔ ہر ضرب پر چٹان کے ٹکڑے اُڑتے گئے۔

دیکھا آپ نے کتنے سنگین حالات میں حضورؐ کو ایسے روشن مستقبل کا یقین تھا اور خدا تعالیٰ نے کیا کیا بشارتیں آپ کو دے رکھی تھیں۔

اس غزوۂ احزاب یا غزوۂ خندق کے خاتمے پر دنیا کے سب سے بڑے بصیرت مند نے فرمایا کہ اب قریش مدینے آکر کبھی نہیں لڑیں گے، اب وقت آرہا ہے کہ ہم اُن پر چڑھائی کریں گے اور پیغمبرِ صادق و مصدوق کی یہ بات سچی نکلی۔

تقریر ۲۲

چند متفرق فوجی کارروائیاں

غزوۂ خندق کے دوران میں یہود بنو قریظہ نے معاہدۂ مدینہ کو پامال کر کے قریش کے ساتھ جو سانٹھ گانٹھ کی تھی، وہ اگر عمل میں آجاتی تو گویا محسنِ انسانیت کی اسلامی جماعت، تحریکِ رحمت و عدل اور مدینے کی خدا پرستانہ ریاست کا خاتمہ ہی ہو جاتا۔ ایسی خوف ناک غداری کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔

رسولِ برحق اور آپؐ کے مجاہدین سرفروش سخت تھکے تھکائے گھروں میں واپس آئے۔ حضورؐ نے ہتھیار کھولے اور غسل فرمایا۔ اسی دوران میں اشارۂ غیبی ہوا، اور آپؐ نے حکم جاری کر کے خدائی فوج کے رضاکاروں کو دوبارہ جمع کیا۔ بہت سے لوگوں نے اپنے ہتھیار کھولے بھی نہ تھے۔ اب وہ رسولِ خداؐ کی کمان میں بنو قریظہ کی طرف مارچ کر رہے تھے۔ بنو قریظہ جلدی سے قلعہ بند ہو گئے۔ مسلم سپاہ نے محاصرہ کر لیا جو ۲۵ دن جاری رہا۔ آخر زچ ہو کر بنو قریظہ نے اپنے آپ کو اسلامی قوت کے حوالے کر دیا۔ حضورؐ نے ان سے گفت و شنید کی، اور ان کی پسند کے مطابق حضرت سعد بن معاذ کو حَکَم ٹھہرایا، اور دونوں طرف سے فیصلہ ان پر چھوڑ دیا گیا۔ حضرت سعد بن معاذ نے تورات کے قانون کے مطابق فیصلہ سنایا جس

کی سخت ترین شق یہ تھی کہ تمام قابلِ جنگ نوجوان قوت کو قتل کر دیا جائے۔ اس طرح غداری کا ایک محاذ ختم ہو گیا!

اب چند متفرق عسکری کارروائیوں کا اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے۔

محمد بن مسلمہ انصاری ۳۰ سواروں کے ساتھ گشت کو نکلے تو نجد کے سردار ثُمامہ بن اُثال سے مڈبھیڑ ہوئی۔ وہ مدینے کے اس بااثر مخالف کو گرفتار کر لائے۔ حضورؐ کے سامنے اسے پیش کیا گیا۔ ثُمامہ کی بڑائی دیکھیے کہ اُس نے حضورؐ سے صاف صاف عرض کیا کہ "یا محمد! اگر مجھے قتل کرو تو ایک واجب القتل آدمی کو قتل کرو گے۔ اگر چھوڑ دو گے تو ایک احسان شناس کو چھوڑو گے۔ اور اگر مال چاہتے ہو تو مقدار بتاؤ، دیا جائے گا" حضورؐ نے عزت مندانہ طریق سے اسے رہا کر دیا۔ ثُمامہ نے حضورؐ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کی اور کہا کہ "آج سے پہلے حضورؐ کے چہرے سے بڑھ کر کوئی اور چہرہ مبغوض نہ تھا، اور آج اس سے زیادہ محبوب چہرہ کوئی نہیں"

مدینے سے جاتے ہی ثُمامہ نے مکے میں جاکر قریش کو سُنا دیا کہ اب تم کو نجد سے غلے کا ایک دانہ بھی نہ مل سکے گا۔

اہلِ رَجیع جو تعلیمی وفد کے ارکان کے قاتل تھے، ان کی سزا دہی کے لیے حضورؐ نے دو سو سواروں کے ساتھ اقدام فرمایا۔ وہ لوگ بھاگ گئے۔

مدینے سے ایک میل کی دوری پر ذی قرد نامی چشمہ ہے، اس کے آس پاس سرکاری اونٹوں اور مویشیوں کی چراگاہ تھی۔ عُسفان کا ایک شخص جانوروں کا گلہ بان تھا۔ رباح نامی غلام کو خبر گیری کے لیے بھیجا گیا۔ سلمہ ابن الاکوعؓ فوجی محافظ تھے۔ یہ ڈیوٹی پر جا رہے تھے۔ کہ صبح صبح عُیَیْنَہ بن حِصْن فَزاری نے اونٹوں پر ڈاکہ ڈالا اور ان کو ہانک لے گیا۔ گلہ بان کو قتل کیا اور اس کی عورت کو بھی ساتھ لے لیا۔ سلمہ نے موقع پر جا کر غارت گری کا سماں دیکھا تو مدینے کی طرف رُخ کر کے "یاصباحاہ" کی پکار بلند کی اور رباح کو کمک لینے کے لیے دوڑایا۔ خود تن تنہا ڈاکوؤں کے تعاقب میں دوڑے۔ تیراندازی کے ماہر تھے۔ ٹولی کے پیچھے سے تاک کر تیر پھینکتے اور ہر تیر ایک نہ ایک مجرم کو نشانہ بناتا۔ راستہ پہاڑی تھا۔ ڈاکو متوجہ ہوتے تو یہ ٹیلوں اور درختوں میں چھپ جاتے اور موقع پا کر تیر پھینکتے۔ گوریلا جنگ

کی یہ ایک اعلیٰ مثال تھی۔ ڈاکوؤں نے پہلے تو اونٹ چھوڑے، پھر بوجھ گھٹانے کے لیے چادریں اور نیزے پھینکتے گئے۔ پیچھے سے کمک آگئی اور حضورؐ خود بھی تشریف لے آئے۔ کچھ جھڑپ دوبدو ہوئی۔ حضرت سلمہ نے عرض کیا کہ آپؐ ایک سو سپاہی میرے ساتھ روانہ کر دیں تو میں سب کا خاتمہ کر آؤں۔ حضورؐ نے فرمایا "جب خدا نے تمہیں غلبہ دے ہی دیا ہے تو اب نرمی سے کام لو۔"

کیا شان تھی اسلامی تحریک کے جانبازوں کی، جیسے رگ رگ میں بجلیاں بھری ہوئی ہوں! کچھ چھوٹی چھوٹی مزید فوجی پارٹیاں آس پاس کے علاقوں میں جاتی رہیں۔ مثلاً بنی اسد کی طرف، بنی ثعلبہ کی طرف، بطنِ نخلہ کے قریب جُموح کی طرف، دُومۃ الجندل کی طرف، قبیلہ سعد بن بکر کی طرف۔

عُکل اور عرُینہ نامی قبائل کے کچھ افراد مدینے آکر مسلمان ہوئے۔ یہ لوگ بیمار تھے۔ علاج کے لیے مدینے کے باہر ٹھہرائے گئے۔ جب اچھے ہو گئے تو سرکاری چرواہے کو پکڑ کر اس کی آنکھوں میں سلائی پھیری، اس کے اعضا کاٹ کاٹ کر اسے بے رحمی سے قتل کیا، اور مویشی ساتھ لے کر بھاگ گئے۔ کُرز بن خالد فہری کی سرکردگی میں ۲۰ سواروں کا دستہ ان کی گرفتاری کے لیے بھیجا گیا۔ گرفتار ہوئے اور ان کو ٹھیک عدل کرتے ہوئے وہی سزا دی گئی جو کچھ اُنھوں نے چرواہے کے ساتھ کیا تھا۔ یہ کارروائی تو ہو گئی مگر آئندہ کے لیے حضورؐ نے حکم دے دیا کہ قصاص میں بھی کسی کے چہرے اور اعضا اور جسم کو بگاڑا نہ جائے۔ وہ عدل تھا اور یہ رحمت تھی۔

تقریر ۲۳

صُلح حُدَیبیہ

اب ہم ہجرت کے چھٹے سال کے اواخر میں بہت بڑے واقعہ سے دوچار ہوتے ہیں جس نے حضورؐ کی تحریکِ اسلامی کی تاریخ پر بہت دوررس اثرات ڈالے۔ یہ واقعہ ہے صُلح حدیبیہ!

خدا پرستانہ تہذیب کے معمار حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خواب میں دیکھا کہ آپؐ مع کچھ اصحاب کے مکے میں امن وامان سے داخل ہوئے اور عمرہ کیا۔ اس خواب کا ذکر آپؐ نے اپنے رفیقوں سے کیا۔ صحابہؓ یہ خواب سنتے ہی بیت اللہ کی زیارت کے لیے بے چین ہو گئے۔

آخر ایک روز رسولِ برحقؐ نے ۱۴ سو صحابہ کو ساتھ لے کر عمرہ کی نیت سے مکے کی راہ پر قدم رکھا۔ یہ ذی قعدہ ۶ ہجری کا واقعہ ہے۔ قربانی کے اونٹ ساتھ لیے۔ ذوالحلیفہ پہنچ کر عرف عام کے مطابق ان کے کوہانوں کو خفیف زخمی کر کے خون آلود کیا گیا اور ان کے گلے میں قلادے ڈالے گئے تاکہ انھیں پہچانا جا سکے کہ قربانی کے اونٹ ہیں۔ عرب میں قربانی کے جانوروں کے ساتھ کوئی تعرض نہیں کیا جاتا تھا۔ سارے مسافر ان راہِ حق نے احرام باندھے، اور صرف حفاظتی ہتھیار لیے گئے، جنگی نہیں۔

حضورؐ نے بنی خزاعہ کے ایک شخص بشر بن سفیان کو آگے روانہ کیا کہ وہ قریش کو حضورؐ کے ارادۂ عمرہ سے آگاہ کریں۔ بشر بن سفیان نے واپس آ کر عُسفان میں حضورؐ کو اطلاع دی کہ قریش نے اطلاع ملتے ہی اپنا لشکر جمع کر لیا ہے اور عہد کر لیا ہے کہ وہ آپ کو مکے میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ نیز خالد بن ولید دوسو سواروں کو لے کر مقام کُراع الغمیم میں پہنچ گیا ہے۔

حضورؐ نے ان معلومات کی روشنی میں اپنا راستہ تبدیل کر لیا۔ دوسری طرف سے ثنیۃ المرار میں پہنچے۔ پاس ہی حدیبیہ نامی کنواں تھا اور اسی نام کا گاؤں۔ حضورؐ نے یہاں پڑاؤ کیا۔ کنوئیں میں پانی کم تھا۔ بطور معجزہ اللہ تعالیٰ نے اس میں یکایک حسب ضرورت اضافہ کر دیا۔

حضورؐ نے خراش بن اُمیہ خزاعی کو اہلِ مکہ سے بات کرنے کے لیے بھیجا۔ مکے والوں نے ان کے اُونٹ کو ذبح کر دیا اور خود وہ خراشؓ کو بھی قتل کرنا چاہتے تھے، مگر بیچ بچاؤ ہو گیا۔

پھر حضرت عثمانؓ کو بھیجا گیا۔ اُنھیں واپس آنے میں دیر لگی۔ افواہ اڑی کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا۔ حضورؐ کو سخت رنج ہوا۔ اور فرمایا کہ میں یہاں سے ہلوں گا نہیں جب تک عثمانؓ کے خون کا بدلہ نہ لے لوں۔ آپؐ نے ایک درخت کے نیچے صحابہؓ سے جانفشانی کی وہ بیعت لی جو بیعتِ رضوان کے نام سے مشہور ہے۔ سورۂ فتح کی آیات کے مطابق اس بیعت کے شرکا، کو اللہ کی رضا حاصل ہوئی۔ قریش کو اس بیعت کی اطلاع ملی تو مرعوب ہو گئے۔ آخر حضرت عثمانؓ واپس آ گئے اور خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

قبیلۂ خزاعہ کے بُدیل بن ورقاءؓ نے خیر خواہانہ طریق سے رسولِ برحق کو قریش کے جذبات اور فوجی تیاریوں کا حال بتایا۔ جواب میں حضورؐ نے فرمایا کہ ہم لڑنے نہیں آئے۔ ہمارا ارادہ صرف عمرہ کرنے کا ہے۔

پھر فرمایا کہ قریش کو لڑائیوں نے بہت کمزور کر دیا ہے، کیوں نہ وہ ایک مدت کیلئے ہم سے صلح کر لیں۔ اس مدت میں ایک دوسرے سے تعرض نہ کیا جائے۔ قریش میرے اور بقیہ عرب کے معاملے کو چھوڑ دیں۔ بُدیل نے قریش سے جا کر گفتگو کی۔ بعض دوسرے اکابر کی طرح عروہ ابنِ مسعود ثقفی نے کہا کہ محمدؐ کی یہ باتیں نہایت پسندیدہ ہیں۔ میں خود جا کر ملتا ہوں۔

اب عُروہ بن مسعود حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضورؐ نے اس سے بھی وہی باتیں کیں۔ وہ متاثر ہوا۔ ساتھ ہی اُس نے صحابہؓ کی طرف سے حضورؐ کی تعظیم کا وہ منظر دیکھا کہ حیرت زدگی کے ساتھ قریش کے سامنے بیان کیا۔ وہ کہتا ہے:

"اے معشرِ قریش! میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے پاس بھی گیا ہوں ۔۔۔۔
مگر بخدا کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کے اصحاب ایسی تعظیم کرتے ہوں
جیسی محمدؐ کی تعظیم اصحابِ محمدؐ کرتے ہیں۔"

پھر کہا: "اے قریش! محمدؐ نے کوئی ایسی بے جا بات تم سے نہیں کی۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں مان لو۔"

پھر بنی کنانہ کا ایک شخص حُلیس گیا۔ اسے دُور سے دیکھ کر حضورؐ نے فرمایا: "قربانی کے جانوروں کو کھڑا کر دو۔ یہ شخص قربانی کے جانوروں کی تعظیم کرتا ہے۔" حُلیس نے قربانی کے اُونٹوں کی قطار کھڑی دیکھی تو وہیں سے واپس آ کر کہا کہ رب کعبہ کی قسم! یہ لوگ تو فقط عمرہ کرنے آئے ہیں، "انھیں بیت اللہ سے نہیں روکا جا سکتا۔" قریش نے اسے گنوار اور جنگلی کہہ کر اُسکی بات کو ٹالنا چاہا۔ اسے بھی جوش آ گیا۔ اس نے کہا: "اگر تم نے محمدؐ کو بیت اللہ کی زیارت سے روکا تو میں تمام احابیش کو لے کر تم سے علیحدہ ہو جاؤں گا۔"

آخر میں سُہیل بن عمرو آئے اور تھوڑی دیر کی بات چیت کے بعد معاہدہ کی شرائط طے پا گئیں۔ اب حضرت علیؓ معاہدہ کی دستاویز لکھنے بیٹھے۔

حضورؐ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھوایا تو سہیل نے کہا کہ ہم رحمٰن و رحیم کو نہیں جانتے، لہٰذا جو رائج طریقہ ہے اس کے مطابق لکھو۔ حضرت علیؓ نے "باسمک اللّٰھم" لکھا۔

دوسری شق میں فریقینِ معاہدہ کے نام لکھے گئے تو حضورؐ کے لیے حضرت علیؓ نے لکھا: "محمد رسول اللہ"۔ سہیل نے کہا کہ اگر ہم محمدؐ کو خدا کا رسول مانتے تو پھر جھگڑا ہی کیا تھا۔ یوں نہ لکھا جائے۔ اب "محمد بن عبداللہ" لکھنے کا فیصلہ ہوا۔ حضرت علیؓ کو ادب مانع ہوا کہ وہ ان الفاظ کو کاٹیں۔ سو رسولِ خداؐ نے خود تبدیلی کر دی۔

شرائط جو طے ہوئیں ان میں سے اہم یہ ہیں:

(۱) دس سال تک فریقین باہم جنگ نہیں کریں گے۔

(۲) محمدؐ کے ساتھیوں میں سے جو حج یا عمرے یا تجارت کے لیے مکّے آئے، اس کو جان و مال کی امان ہوگی اور قریش کا جو شخص تجارت کے لیے مصر یا شام جاتے ہوئے مدینے سے گزرے اسے بھی جان و مال کی امان ہوگی۔

(۳) قریش کا جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر محمدؐ کے پاس پہنچے گا تو آپ اسے واپس کر دیں گے۔ اور محمدؐ کے ساتھیوں میں سے جو شخص قریش کے پاس آئے گا، وہ واپس نہیں کریں گے۔

(۴) معاہدانہ ذمہ داریوں میں کوئی چاہے تو محمدؐ کے ساتھ ہو، اور چاہے تو قریش کے ساتھ

(۵) اس سال محمدؐ بغیر عمرہ کیے واپس چلے جائیں گے البتہ آئندہ سال وہ تین دن رات کے لیے مکّے میں آسکیں گے اور اس کے بعد شہر سے باہر چلے جائیں گے۔

ابھی یہ معاہدہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ سہیل کے بیٹے ابوجندل قید سے نکل کر پابہ زنجیر حاضر ہوئے۔ مسلمان ہو چکے تھے اور قریش کی ایذا رسانیوں کا شکار تھے۔ سہیل نے انھیں دیکھتے ہی کہا کہ یہ پہلا شخص ہے جو معاہدے کے مطابق واپس ہونا چاہیے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ابھی تو تحریر مکمل نہیں ہوئی۔ سہیل نے کہا کہ اس صورت میں کسی بات پر قطعاً صلح نہیں ہو سکتی۔ آخر بادلِ نخواستہ حضورؐ نے اُس نوجوان کو واپس کر دیا اور ابوجندل کو تسلی دی کہ اللہ تعالیٰ تمہاری نجات کی کوئی صورت نکالے گا۔

ابوجندل کی واپسی کا مسلمانوں پر سخت جذباتی اثر پڑا۔ حضرت عمرؓ نے حضورؐ سے مکالمہ کرتے ہوئے کہا کہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ اگر ہیں تو کفّار کے سامنے ایسی ذلّت کیوں گوارا کریں؟ حضورؐ نے ٹھنڈے طریق سے جواب دیا کہ "میں اللہ کا رسولِ برحق ہوں، اس کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔"

تکمیلِ صلح کے بعد حضورؐ پاک نے صحابہ کو قربانی کرنے اور سر منڈانے کا حکم دیا۔ مگر صحابہ صلح کے ظاہری واقعات سے اس طرح شکستہ خاطر تھے کہ کوئی بھی نہ ہلا جلا۔ اس موقع پر حضرت ام سلمہؓ نے مشورہ دیا کہ یا رسول اللہ! یہ صلح مسلمانوں پر بہت شاق گزری ہے، آپ ان سے کچھ نہ کہیں، خود قربانی کر کے اپنے بال اتروائیں۔ صحابہ خود بخود اتباع کریں گے۔ اور بالکل ایسا ہی ہوا۔

دو ہفتے قیام کرنے کے بعد حدیبیہ سے رسولِ پاک اور دینِ حق کے ۱۴۰۰ سو علمبردار واپس روانہ ہوئے۔ راستے میں سورہ فتح کا نزول ہوا۔ حضورؐ نے صحابہ کو جمع کر کے ارشادِ الٰہی سنایا کہ یہ فتح مبین ہے تو تعجب سے کئی حضرات نے پوچھا "یا رسول اللہ! کیا یہ فتح ہے؟" آپؐ نے جواب دیا۔ "قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، بے شک یہ عظیم الشان فتح ہے۔" بعد کے واقعات نے بتا دیا کہ اشاعتِ اسلام کے لحاظ سے، قریش سے امن میں رہ کر دوسرے دشمنوں کی سرکوبی کے لحاظ سے، اور فتح مکّہ کا محرک مہیّا کرنے کے لحاظ سے واقعی یہ فتح مبین تھی۔

بعد میں حضرتِ عمرؓ کو ساری عمر حضورؐ سے جذباتی انداز میں گفتگو کرنے پر شرمساری رہی اور روزے رکھ رکھ کر اس کا کفّارہ ادا کرنے میں لگے رہے۔

تقریر ۲۴

بین الاقوامی دعوت کا آغاز

یکم محرم ۷ھ ہجری، چہار شنبہ کا دن ہے۔ حضورؐ قائدِ انسانیت کے تمام صحابہؓ مسجد میں جمع ہیں۔ آپؐ خصوصی خطاب فرماتے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے:

"اے لوگو! مجھ کو خدا نے تمام دنیا کے لیے پیغمبرِ رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ دیکھو، عیسٰی علیہ السلام کے حواریوں کی طرح اختلاف نہ کرنا۔ جاؤ اور میری طرف سے حق کی دعوت کو پھیلانے کا فریضہ ادا کرو۔"

یہ خطبہ دراصل تمہید تھا، مدینے میں بین الاقوامی دعوت کی نئی مہم کا۔ دینِ برحق کی انقلابی تحریکِ فلاح کو اب تک مقامی کشاکش نے عالمِ انسانی کے وسیع دائرے میں کام کرنے کا موقع ہی نہ دیا تھا اور یہ صورت ہر دعوت، جماعت اور تحریک کو پیش آتی ہے۔ اولاً وہ مقامی، ملکی اور قومی سطح پر کام کرتی ہے۔ اس مرحلے سے اگر وہ کامیاب نکلے تو کام کو آگے بڑھایا جاتا ہے۔

صلحِ حدیبیہ نے قریش کے حملوں سے جب رسولِ عدل و رحمتؐ کو فارغ کر دیا تو آپؐ نے فوراً اپنے جہانی پیغام کو ملک سے باہر پہنچانے کی مہم شروع کر دی۔ اس کام کی ابتدا

مکاتیب سے ہوئی جو مختلف بادشاہوں اور سرداروں کو لکھے گئے۔

حضورؐ پاک نے صحابہؓ کے مشورے سے خطوط پر لگانے کے لیے ایک مہر تیار کرائی جس کے نگینے پر "محمدؐ رسول اللہ" کے الفاظ کندہ تھے۔

خدا پرستانہ بنیادوں پر قائم ہونے والی انقلابی ریاست کے سربراہ اور داعیٔ حق ہونے کی حیثیت سے حضورؐ نے قیصرِ روم، شہنشاہِ عجم، عزیزِ مصر اور روسائے عرب کے نام خطوط روانہ فرمائے جنھیں آپؐ کے مامور کردہ صحابی لے کر روانہ ہوئے۔

ہرقل قیصرِ روم کو جو خط بھیجا گیا۔ اس کا اہم حصّہ یہ تھا:

"اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ یہ خط محمدؐ کی طرف سے جو خدا کا بندہ اور رسول ہے، ہرقل کے نام ہے جو روم کا رئیس اعظم ہے۔ سلامتی ہو اس کے لیے جو ہدایت کی راہ اختیار کرے۔ اس تمہید کے بعد میں تم کو اسلام کی طرف بلاتا ہوں۔ اسلام قبول کرو تو تم سلامت رہو گے۔ اور خدا تمھیں دُگنا اجر دے گا اور اگر تم نے یہ دعوت نہ مانی تو تمام اہلِ ملک کا گناہ تمھارے سر ہوگا۔ . . . "

یہ خط جب بیت المقدس میں قیصرِ روم کو ملا تو اُس نے حکم دیا کہ عرب کا کوئی آدمی ادھر آیا ہوا ہو تو اسے پیش کیا جائے۔ اتفاق سے ابوسُفیان تجارت کے لیے اُدھر گیا ہوا تھا۔ اسے اس کے ساتھیوں سمیت دربار میں پیش کیا گیا اور قیصر نے اس سے چند سوالات کیے۔ ابوسفیان کو ساتھیوں کے روبرو ہونے کی وجہ سے جھوٹ بولنے کی ہمّت نہ ہوئی۔ اس نے بہ حیثیت ایک مخالفِ رسولؐ کے جو جواب دیے، ان سے ہرقل بہت مطمئن ہوا۔ اور بہت اچھے تاثرات ظاہر کیے۔ آخر میں یہ کہا کہ جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا پر بھی جھوٹ نہیں باندھ سکتا۔ اور یہ پیغمبر ہی کی شان ہے کہ وہ نماز، تقویٰ اور عفاف کی ہدایت کرتا ہے۔ پھر کہا کہ ہاں وہ ضرور "نبی" ہے۔ ہمیں پہلے سے انتظار تھا کہ ایک نبیؐ کا ظہور ہونے والا ہے، مگر یہ معلوم نہ تھا کہ وہ تم لوگوں میں سے اُٹھے گا۔ کاش میں ان کی زیارت کر سکتا۔ پاس ہوتا تو ان کا پیرو ہوتا۔ ایک دن اُن کی حکومت اِس مقام تک

پہنچے گی جہاں اس وقت میرا قدم ہے۔ سیرت نگاروں کی روایات کے بموجب اُس نے حضورؐ کو لکھا کہ "میں تو مسلمان ہوں"۔ اس فقرے پر حضورؐ نے فرمایا کہ "جھوٹ کہتا ہے، وہ تو اپنی نصرانیت پر ہے۔"

ایران کے شہنشاہ خسرو پرویز کو جب حضورؐ کی طرف سے دعوتِ اسلامی کا خط پہنچا تو غصّے میں آکر اُس نے خط کو پارہ پارہ کر دیا اور کہا کہ "میرا غلام ہو کر مجھ کو یوں لکھتا ہے"۔ حکمتِ خداوندی کو دیکھیے کہ قلیل مدّت میں خود سلطنتِ عجم کے پرزے اُڑ گئے۔ روایت یہ بھی ہے کہ خسرو نے یمن کے گورنر باذان کو لکھا کہ اس مدعیٔ نبوت کو گرفتار کر کے میرے دربار میں بھیج دو۔ باذان نے دو افراد کی یہ ڈیوٹی لگائی۔ وہ بارگاہِ رسالت میں آکر کہنے لگے کہ اس حکم کی تعمیل نہ ہوئی تو خسرو آپ کے ملک کو برباد کر دیگا۔ حضورؐ نے فرمایا: واپس جاکر کہہ دو کہ اسلام کی حکومت کسریٰ کے پایۂ تخت تک پہنچے گی۔ دوسری روایت کی رُو سے رسولؐ خدا نے ان سے کہا کہ واپس وہاں جاکر دیکھو کہ خسرو اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے۔ یہ باتیں جب حاکم یمن باذان کو معلوم ہوئیں اور حضورؐ کی تعلیم و دعوت اور عادات و اخلاق کا نقشہ سامنے آیا تو وہ خود بھی مسلمان ہو گیا، اور اس کے درباری اور ملک کے اکثر عوام بھی مسلمان ہو گئے۔

یہ اسلام کی بین الاقوامی دعوت کی پہلی بڑی کامیابی تھی!

مُقَوقس بادشاہِ مصر نے نامۂ مبارک کو پڑھ کر بہت اچھّے تاثرات کا اظہار کیا، اور خط کو احترام کے ساتھ ہاتھی دانت کی ایک ڈبیہ میں محفوظ کیا۔ جواباً بہت مؤدبانہ انداز سے خط لکھا، دو معزز کنیزیں، سواری کا ایک خچر اور کچھ پارچات ہدیہ میں روانہ کیے۔ رسول اللہ کے قاصد حضرت حاطبؓ کو پورا لباس اور سو مثقال سونا دیا۔

حبشہ کے فرماں روا شاہِ نجاشی نے نامہ مبارک کے جواب میں اپنے قبولِ اسلام اور حضورؐ کی رسالت پر ایمان لانے کا ذکر کیا ہے۔

ہَوذہ بن علی سردار یمامہ نے ادب و احترام سے نامۂ مبارک کو سُنا اور جواب بھی اچھا دیا۔ مگر اتباع کرنے کی شرط یہ رکھی کہ اختیارات میں سے مجھے بھی حصّہ دیجیے۔ حضورؐ نے

اس شرط کو ناپسند فرمایا۔ ہَوذہ کا جلد ہی انتقال ہو گیا۔

ایک خط حارث ابن شمر غسّانی رئیس حدودِ شام کو موصول ہوا۔ پہلے تو وہ خط سُن کر بہت بگڑا۔ بعد میں قاصد کو بڑے اعزاز کے ساتھ رُخصت کیا۔

اس تحریری طریقِ دعوت سے محسن انسانیت کا تعارف آس پاس کے بڑے اور چھوٹے درباروں میں ہو گیا۔ آپؐ کی دعوت و تعلیم اور آپؐ کے منصبِ نبوت کا چرچا مختلف علاقوں میں ہونے لگا۔ بیرونی علاقوں کے کچھ اہم اشخاص اور متعدد عوام آپؐ پر ایمان لائے، بعض نے اچھے تاثرات اپنے سینوں میں محفوظ رکھے اور سوچ میں پڑ گئے۔ بعض نے مخالفانہ ردِّعمل دکھایا، مگر یہ بھی حضورؐ کے تعارف کو عام کرنے کا ذریعہ بنا۔ ساتھ ہی ساتھ اِردگرد کی حکومتوں کو یہ محسوس کرا دیا گیا کہ اب ایک نئی منظم ریاست عرب کی اس سرزمین میں موجود ہے، جہاں پہلے قبائل طوائف الملوکی کا شکار تھے۔

مختصر یہ کہ چند دنوں میں محسنِ انسانیت کی دعوتِ فلاح و سعادت بین الاقوامی دائرے میں داخل ہو گئی!

تقریر ۲۵

غزوۂ خیبر

اب بین الاقوامیت سے پھر داخلیت کی طرف!

پیغمبر آخر الزماںؐ ذی الحجہ ۶ھ میں حدیبیہ سے واپس تشریف لائے۔ کچھ دن مدینے ہی میں گزارے۔ محرم کے اوائل میں خیبر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ذرا یہ بات ذہن میں تازہ کر لیجئے کہ یہود حضورؐ پاک اور مسلم قوت اور اسلامی ریاست کے خلاف مسلسل غدّارانہ کارروائیوں کے مجرم تھے۔

معاہدۂ مدینہ کی بار بار خلاف ورزیاں، مسلمانوں کے دشمنوں سے ساز باز، مسلمانوں میں تفرقہ کی کوشش، پیغمبر خدا کے خلاف جذبۂ توہین، نیز حضورؐ کی محفلوں میں جاسوس بھیج کر ہر شب ان کی رپورٹوں پر غور کر کے سازشیں تیار کرنا۔ نظام انصاف میں رخنہ اندازی، منافقین کے گروہ کی سرپرستی، جنگ کے موقعوں میں ذمہ داریوں سے روگردانی، مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی مساعی، حضورؐ کے گھر کی فضا کو خراب کرنے کے لیے بعض عورتوں کے ذریعہ فتنہ پروری، یہ سارے واقعات بڑی تفصیل چاہتے ہیں۔ ان کو الگ رکھ کر اگر صرف قتل کی سازشوں اور اقدامات کو دیکھا جائے جو حضورؐ کی جان لینے کے لیے کی گئیں تو ہر کوئی

اندازہ کر سکتا ہے کہ یہودی قوت کے ہاتھوں، پیغمبر اسلام، اسلام، اسلامی تحریک اور اسلامی ریاست کو کتنا بڑا خطرہ درپیش تھا۔ آخر ایک دن حضورؐ پاک ۱۴۰۰ پیدل اور ۲۰۰ سوار دل کے ساتھ خیبر کی راہ پر گامزن ہوئے۔ مدینے میں سباع بن عرفطہ غفاری کو قائم مقام مقرر کیا گیا۔ علمِ اسلام حضرت علیؓ ابن ابی طالب کے مبارک ہاتھوں میں تھا۔ ام المومنین حضرت امّ سلمہ اور چند دوسری خواتین بھی لشکر کے ساتھ گئیں۔ مقدمۂ لشکر کے سردار عکاشہ بن محصن اور میمنہ کے سردار حضرت عمر فاروقؓ تھے۔

یہ لشکرِ مجاہدین مقام رجیع میں جا اُترا۔ یہ جگہ بنو غطفان اور اہلِ خیبر کے درمیان تھی۔ پہلے تو مسلم فوج کی آمد کا حال سن کر بنو غطفان خیبر والوں کی مدد کے لیے نکلے، مگر پھر خیال آیا کہ ہمارے اپنے گھر خالی ہوں گے۔ سو بچارے لَوٹ گئے۔

حضورؐ نے لشکر کے بارے طے کیا کہ پڑاؤ اس جگہ رہے گا، اور مختلف دستے جا کر اطراف میں کارروائی کریں گے۔ حضرت عثمانؓ غنی کو اس مرکزی کیمپ کا کمانڈر یا نگران مقرر کیا گیا۔ خواتین اور سامانِ رسد کو یہاں رکھا گیا۔

پہلا حملہ حضرت محمود بن مسلمہ نے قلعہ ناعم پر کیا، مگر قلعہ کے فتح ہونے سے پہلے ایک دن محمود بن مسلمہ قلعے کی دیوار کے سایہ میں سستانے کے لیے جا لیٹے، اوپر سے یہودیوں نے چکی کا پاٹ گرا کر آپؓ کو شہید کر دیا۔ پھر ان کے بڑے بھائی محمد بن مسلمہ نے مجاہدین کی قیادت کی اور قلعہ فتح ہو گیا۔ اس دوران میں قلعہ صعب بھی قبضے میں آ گیا جس کا محاصرہ حضرت خبّاب ابن المنذر کیے ہوئے تھے۔ اس قلعے سے مسلمانوں کو بہت سا اسلحہ اور سامانِ رسد ملا۔ قلعہ نطاۃ جس کا ایک حصہ قلعہ زبیر بھی تھا، اس کی فتح آسان نہ تھی، مگر ایک یہودی خود ہی لشکرِ اسلام میں آیا اور اس نے بتایا کہ قلعے کے اندر جس زمین دوز نالے سے پانی جاتا ہے، اسے بند کرنے سے قلعہ بہت جلد فتح ہو جائے گا۔ یہی ہوا۔ پانی بند ہوتے ہی یہودی قلعے سے باہر آ گئے۔ اسی طرح قلعہ شِق اور قلعہ برّ بھی مفتوح ہوئے۔ کچھ مشکل قلعہ قموص کے متعلق پیش آئی۔ ۲۰ روزہ محاصرہ کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ تب حضورؐ نے مجمع میں فرمایا کہ کل ہم اس قلعے کے لشکر کا علم اُس شخص کو دیں گے جس سے اللہ اور اس کا نبیؐ خاص محبّت کرتے ہیں۔ یہ علم حضرت

سیدہ عائشہ کی چادر سے بنایا گیا تھا۔ اگلی صبح کو حضورؐ نے حضرت علیؓ کو پکار کر علم دیا اور فرمایا جاؤ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔" پہلے اسلام کی دعوت دو، پھر لڑو۔" اور اسلامی حکومت کی بنیادی پالیسی کا یہ کلیہ بیان فرمایا: "تمھارے ذریعے ایک شخص کا اسلام لانا، بے شمار مال و دولت کے لانے سے بہتر ہے۔" یہ فقرہ گواہ ہے کہ مطلوب فتوحات و اموال نہ تھے، بلکہ انسانوں کی صلاح و فلاح تھی۔

اب ہم سرسری طور پر حضورؐ کے خلاف یہود کی طرف سے قتل کی ناکام کوششوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ۴ھ میں حضورؐ بنو نضیر کے ہاں تشریف لے گئے، وہاں چھت سے چکی کا پاٹ گرانے کی اسکیم بنائی گئی۔ کعب بن اشرف نے بھی کچھ آدمیوں کو مامور کیا تھا کہ حضورؐ جب اِدھر آئیں تو کام تمام کر دو۔ بنو قریظہ سے تجدید معاہدہ کے زمانے میں بنو نضیر نے معاملہ طے کرنے کے لیے آپ کو بلوایا اور دوسری طرف تلواروں سے مسلح یہود کو تیار کر دیا کہ وہ پیغمبر کو قتل کر دیں۔ کچھ واقعات ذرا بعد کے دور سے متعلق ہیں۔ وہ تو اللہ کی حفاظتِ خاص تھی۔ جیسا کہ قرآن میں ہے: واللہ یعصمک من الناس[1] چنانچہ حضورؐ پر معاندین کا کوئی وار کارگر نہ ہوا۔ ورنہ انھوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

حضورؐ جب حدیبیہ سے واپس آئے تو وہاں کے احوال سن کر یہودیوں نے یہی سمجھا کہ پسپا ہو کر آئے ہیں۔ پھر خیبر کے یہودی ارادہ کرنے لگے کہ اس وقت مسلمان کمزور حالت میں ہیں، کیوں نہ اُن پر حملہ کر دیا جائے۔ خیبر ان کا مضبوط گڑھ تھا۔ علاقہ زرخیز تھا، مالی حالت اچھی تھی۔ تمام بستیوں کی اپنی اپنی قلعہ بندیوں کا ایک سلسلہ تھا۔ خیبر والوں نے بنی غطفان کے چار ہزار نوجوانوں کو اس شرط پر مدینے پر حملہ کرنے کے لیے تیار کر لیا کہ فتح مدینہ کے بعد زمین خیبر کی نصف پیداوار ان کو دیں گے۔

اِدھر رسولؐ برحق اہلِ خیبر کی ان تیاریوں سے برابر آگاہ تھے۔ اب بجائے اس کے کہ آپؐ یہود کے حملے کا انتظار کرتے، خود آگے بڑھ کر ان کی سرکوبی کرنا مناسب سمجھا۔ مدینے

---

[1] المائدہ ۶۷

کے دفاع کے لیے خیبر کی طرف فوجی اقدام ضروری تھا۔

مسلمانوں کے حق میں اِس پہلے ہی موقع پر معاہدۂ حدیبیہ کی ایک برکت سامنے آئی۔ یعنی اب قریش اس طرح بندھ گئے تھے کہ یہود ان سے کوئی مدد حاصل کرنے کی امید نہیں کر سکتے تھے اور مسلمان ایک بڑی دشمن طاقت کی طرف سے بالکل بےخوف تھے۔

مدینے سے مسلم فوج جب اقدام کرنے لگی تو ہائی کمان نے ہدایت جاری کی جو لوگ سفرِ حدیبیہ میں شریک نہیں ہوئے تھے، وہ خیبر کی مہم میں بھی شریک نہ ہوں۔ مطلوب یہ تھا کہ خطروں سے بھاگنے اور عذرات پیش کرنے والے منافقین کو ساتھ نہ لیا جائے۔ یہ لشکر صرف بیعتِ رضوان سے مشرف ہونے والوں پر مشتمل ہوا۔ یہ وہ ہستیاں تھیں جن کے لیے خدا نے قرآن میں فرمایا، لقد رضی اللہ عن المومنین اذیبا یعونك تحت الشجرہ۔[۲]
(ترجمہ: خدا مومنین سے راضی ہوا جبکہ وہ درخت کے نیچے تمہارے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے)

یہ سعادت حضرت علیؓ کے حصے میں آئی کہ قلعۂ قموص جس کا سردار مرحب تھا تائیدِ ایزدی سے مسلمانوں کے زیرنگیں ہوا۔ اسی طرح الکتیبہ، الوطیح اور السلالم نامی قلعے جن میں یہود کی آخری قوت سمٹ گئی تھی، یکے بعد دیگرے فتح کر لیے گئے۔ اب یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیے اور صلح کی درخواست کی جسے امن و سلامتی کے پیغامبر نے کشادہ دلی سے قبول کیا۔

یاد رہے کہ اس موقع پر یہودی سردار مرحب کی بہن نے حضورؐ اور آپؐ کے صحابہ کی دعوت کی اور گوشت میں زہر ملا دیا۔ حضورؐ پاک نے ایک لقمہ لیتے ہی کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ صحابہ نے بھی تقلید کی۔ صرف ایک حضرت بشر بن براء پر زہر کا اثر ہوگیا اور وہ انتقال کر گئے۔ حضورؐ کے عفو و رحمت کا کمال دیکھئے کہ سارا معاملہ ثابت ہو جانے کے باوجود زہر خورانی کی مجرم عورت سے کوئی انتقام نہیں لیا۔

غزوۂ خیبر میں ۱۸ مسلمان شہید اور ۵۰ زخمی ہوئے۔ دشمن کے مقتولین کی تعداد ۹۳ تھی۔ یہود بازی ہر گئے تو ان کو رعیت کی حیثیت دی گئی اور ان کی زمینوں اور باغوں پہ

---

[۲] الفتح ۱۸۔

پر حکومت مدینہ کا استحقاق قائم کر دیا گیا اور پیداوار کے نصف پر معاملہ طے ہوا۔

چند یہودی افراد اس موقع پر اسلام لائے۔ ان میں سے ایک حبشی چرواہا اسود راعی تھا۔ اس نے یہود سے پوچھا کہ لڑائی آخر کس بات پر ہے؟ انھوں نے حضورؐ کے دعوائے نبوت کا ذکر کیا۔ پھر وہ حضورؐ سے آکر ملا اور آپؐ سے پوچھا کہ آپ کی دعوت کیا ہے؟ آپؐ نے اسلام کا نظریۂ توحید اور اسلام کے اخلاقی تصوّرات بیان کیے تو وہ فوراً مسلمان ہو گیا۔

اسی موقع پر حضرت جعفر بن ابی طالب کئی ساتھیوں سمیت حبشہ سے یہاں آپہنچے۔

خیبر کے بعد یہود کا دوسرا ایک گڑھ وادی القریٰ میں تھا۔ اسے بھی چند روز میں مسلم قوّت نے فتح کر لیا اور اُن سے بھی وہی شرائط طے پائیں جو خیبر والوں کے لیے تھیں۔

بعدازاں بنو غطفان، بنو محارب، بنو ثعلبہ اور بنو انمار کے متعلق اطلاع ملی کہ حملہ کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ حضورؐ پاک ۴۰۰ کا لشکر لے کر نکلے۔ دُشمن منتشر ہو گیا۔ یہ مہم غزوۂ ذات الرِّقاع کہلاتی ہے۔

صلح حدیبیہ کے تحت قریش کے لیے شامی شاہ راہِ تجارت کھل گئی۔ مگر ابوجندلؓ قریش کی قید سے نکل کر آئے اور معاہدے کی وجہ سے مدینہ میں ٹھہرنے کا موقع نہ پاکر ساحل کے متصل ایک پہاڑی پر مقیم ہو گئے۔ اُنھوں نے قریش کے ایک قافلے پر حملہ کر کے مال چھین لیا۔ بعد میں حضورؐ کی سفارش سے واپس کیا۔ ان کے ساتھ اور نوجوان بھی بھاگ بھاگ کر جمع ہونے لگے۔

اب قریش پچھتائے کہ جس شرط کو اُنھوں نے اپنے لیے مفید سمجھا تھا، وہی مصیبت کا باعث ہو گئی۔ یوں مسلمانوں کے حق میں معاہدۂ حدیبیہ کا ایک اور مفید پہلو سامنے آیا۔ ☙

تقریر ۲۶

عُمرۃ القضا

۶ھ کے معاہدہ حدیبیہ میں شرط طے ہوئی تھی کہ آئندہ سال رسولِ برحق اور صحابہ کرام مکّے آکر عمرہ ادا کریں گے اور تین دن کے قیام کے بعد واپس چلے جائیں گے۔

معاہدے کے ایک سال بعد ذی قعدہ ۷ھ کو نبی اکرم عمرہ کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ نے اعلان کیا کہ ان رفیقوں میں سے کوئی رہ نہ جائے جو صلح حدیبیہ میں شریک تھے۔ سوائے ان چند افراد کے جو اس دوران میں انتقال فرما چکے تھے، بقیہ تمام غازیانِ سفرِ حدیبیہ حضورؐ کے ہم سفر ہوئے۔ ساٹھ یا اسی جانور قربانی کے لیے ساتھ لے جائے گئے۔

معاہدہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ مسلمان مکّے میں ہتھیار لے کر داخل نہ ہوں۔ اسے ملحوظ رکھتے ہوئے حضورؐ نے اپنا اسلحۂ جنگ مکّے سے آٹھ میل دُور بطنِ یاجج میں دو سو سواروں کی نگرانی میں چھوڑ دیا۔ پھر رسولِ رحمت کی امارت میں یہ قافلۂ زائرین حرمِ پاک کی طرف گامزن ہوا۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اونٹ کی مہار پکڑے آگے آگے تھے، اور رجزیہ اشعار پڑھتے جا رہے تھے۔ مفہوم یہ تھا:

"اُس ہستی کا نام لے کر ہم داخل ہوتے ہیں جس کے دین کے علاوہ کوئی دین نہیں۔

اس کے نام کے ساتھ جس کے رسول محمدؐ ہیں۔

اے اولادِ کفّار! راستے سے ہٹ جاؤ۔ ہمیں الرحمٰن نے اپنی نازل کردہ کتاب میں یہ تعلیم دی کہ بہترین جنگ وہ ہے جو اللہ کے راستے میں لڑی جائے۔ اے خدا! میں تیری کتاب کے فرمان پر ایمان رکھتا ہوں۔"

اس رجز سے ظاہر ہے کہ مسلمان جن کے ذہنوں میں پچھلے سال کے واقعات کا پس منظر تازہ تھا۔ بڑے جوش میں تھے۔ مکّے میں مشہور ہو گیا تھا کہ مدینے کی آب وہوا نے مسلمانوں کو کمزور کر دیا ہے۔ اس اثر کو مٹانے کے لیے حضورؐ نے صحابہ کو حکم دیا کہ وہ طواف کے پہلے تین پھیروں میں اکڑ کر چلیں۔ رَمل کی یہ چال آج تک بطورِ سُنت قائم ہے۔

سردارانِ مکّہ میں تو یہ تاب ہی نہ تھی کہ وہ اس منظر کو دیکھ سکیں کہ حضورؐ مع صحابہ کے مکّے میں داخل ہو کر عمرہ کریں۔ یہ لوگ شہر چھوڑ کر پہاڑوں پر چلے گئے تھے۔ تین دن گزرنے پر قریش نے دو قاصدوں کے ذریعے حضورؐ تک یہ پیغام پہنچایا کہ اب مسلمانوں کو مکّے سے چلے جانا چاہیے۔ پیغام ملتے ہی حضورؐ نے روانگی کا اعلان کیا، اور مکّے کو خالی کر دیا۔

غور کیجیے کہ دور اندیشانہ وعدے کی بنا پر حضورؐ نے ایک ہی سال بعد یہ مقام حاصل کیا کہ مکّے میں تین دن تک آزادی سے اپنے صحابہ سمیت چل پھر رہے ہیں اور قریش بے بسی سے یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔

اس واقعے کے چند اہم پہلوؤں پر نظر رہنی چاہیے۔

اوّل یہ کہ حضورؐ نے مکّے میں داخلے کے وقت جماعت کو حکم دیا کہ خوب مونڈھے کھول کر سینے تان کر چلو اور پھیل پھیل کر طواف کرو۔

اس حکم میں ایک مصلحت تو عسکری نوعیت کی ہو سکتی ہے کہ سپاہ کو دشمن کے سامنے جاتے ہوئے کس صورت میں جانا چاہیے۔ دوسرا منشا یہ تھا کہ اس پروپیگنڈے کی تردید ہو جائے کہ مسلمان کمزور ہو گئے ہیں۔ اس سے سبق یہ ملتا ہے کہ دُشمن کے سامنے کبھی اپنی کمزوری واضح نہیں ہونے دینی چاہیے بلکہ قوّت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ ایسے موقعوں پر اکڑنا اور زور دکھانا سب کچھ نیکی ہے۔ اور بخلاف اس کے انکسار کا مظاہرہ کرنا نیکی نہیں ہے۔

دوم یہ کہ ذرا اُس وقت کے منظر کو نگاہوں میں لائیے کہ مسلمان تو وسطِ شہر میں طواف کر رہے ہوں گے اور شہر کے عوام اور عورتیں اور بچے چاروں طرف کی بلندیوں سے اس منظر کو دیکھ رہے ہوں گے۔ ساتھ ہی تاریخ کا گزشتہ سیاہ ورق بھی ان کے سامنے ہوگا کہ یہی وہ قوت تھی جسے کچلنے کے لیے اسی حرم میں اور اسی مکے کی گلیوں میں ہر ظلم ڈھایا گیا تھا اور آج یہ روشن ورق بھی دکھائی دے رہا ہوگا کہ کل جو قوت یہاں کچلی جارہی تھی، وہ اب اتنی مضبوط ہو کر مکّے میں آئی ہے کہ کوئی اسے داخلے سے روک نہیں سکتا، کوئی اس سے تعرض نہیں کر سکتا۔

سوم یہ کہ اتنی بڑی تعداد دشمنوں کے شہر میں آکر تین دن تک رہی، مگر نہ کوئی لوٹ مار ہوئی، نہ کوئی مکان ڈھایا گیا، نہ کوئی سامان اُٹھایا گیا، نہ کسی خاتون پر دست درازی ہوئی، نہ کسی مرد پر ہاتھ اُٹھایا گیا۔ یہ وہ خوبی تھی جس کی مثال پچھلے جاہلی دور کی کوئی قوت کبھی پیش نہ کر سکی ہوگی۔ اور آج کی جدید جاہلیت نے بھی کب ایسی کوئی مثال ہمارے سامنے رکھی ہے؟

چہارم یہ کہ جب اس پورے واقعہ کا مکّے کے حوالی اور عرب میں چرچا ہوا ہوگا تو کتنی اہمیت بڑھ گئی ہوگی لوگوں کی نگاہ میں مسلم جماعت کی! اور کتنی قیمت کم ہو گئی ہوگی قریشِ مکّہ کی۔ بہت سے لوگوں نے صاف طور پر سمجھ لیا ہوگا کہ مستقبل کی قوت مسلم قوت ہے۔

تقریر ۲۷

فتحِ مکّہ

صلحِ حدیبیہ کی پیدا کردہ فضا سے فائدہ اُٹھا کر رسولِ برحق نے ایک طرف تو مدینے کے مرکز کو فتنہ پسندوں سے پاک کر لیا۔ دوسری طرف شمال میں یہودی قوت کے جو مراکز سازشوں کا گڑھ بنے ہوئے تھے، اُن کا زور توڑ دیا۔ تیسری طرف قبائل کی چھوٹی چھوٹی شورشوں اور فتنہ پردازیوں کا پے در پے ایسی سرگرمی سے نوٹس لیا کہ حکومت کی گرفت دور دور تک مضبوط ہو گئی۔ معرکۂ خندق کے بعد آہستہ آہستہ اسلامی ریاست کی دھاک بیٹھ گئی، ہر طرف محسوس ہونے لگا کہ سچائی اور انصاف کی یہ نئی طاقت جو ابھر رہی ہے، یہ کوئی ایسا غبار نہیں ہے جو ہوا کے جھونکے کے ساتھ غائب ہو جائے۔

اب مدینے کی تحریکِ اسلامی کے سامنے سب سے بڑا جنگی مرحلہ یہی رہ گیا تھا کہ دشمن کی قوت کے اصل مرکز کو ختم کیا جائے، ورنہ جنگ و جدل کا سلسلہ کہیں رک نہ سکے گا۔ قریش کی شامتِ اعمال کہ اُنھوں نے خود ہی اس کی وجہ فراہم کر دی۔

پس منظر یہ تھا کہ مکّے کے آس پاس کے دو بڑے قبائل بنو بکر اور بنو خزاعہ کے درمیان مدّتوں سے مخاصمت تھی۔ وقتی طور پر یوں ہوا کہ اسلام جب ایک چیلنج بن کے اُبھرا

تو قریش نے اس کے خلاف اپنا محاذ تیار کرتے ہوئے بنو بکر اور بنو خزاعہ دونوں کو ساتھ لیا۔ ان کا باہمی عناد عارضی طور سے دب گیا۔ مگر جب معاہدۂ حدیبیہ طے پا یا اور دس برس کے لیے مکّے اور مدینے کے درمیان جنگی فضا ختم کر دی گئی تو بنو بکر اور بنو خزاعہ نے اپنے آپ کو اسی مقام پر پایا جہاں وہ نسلوں سے چلے آرہے تھے۔ معاہدے کی ایک شرط کے مطابق بنو بکر نے قریش سے حلیفانہ تعلّق جوڑا اور بنو خزاعہ نے ان کے خلاف پیغمبر آخر الزماںؐ اور آپؐ کی حکومت سے پیمانِ وفا باندھا۔ کچھ مدّت تک خاموشی طاری رہی۔ پھر ایسا ہوا کہ بنو بکر نے بنو خزاعہ پر بھرپور حملہ کیا۔ جن لوگوں نے حرم میں جا کر پناہ لی ان کو بھی نہ بخشا، اور ستم یہ کہ قریش نے بنو بکر کی مدد کی۔ بنو خزاعہ کی طرف سے عمرو بن سالم نے حضورؐ کی خدمت میں جا کر فریاد کی۔ حضورؐ نے قاصد کے ذریعے قریش کے سامنے تین صورتیں رکھیں! ایک یہ کہ بنو خزاعہ کے مقتولین کا خون بہا ادا کرو، دوسری یہ کہ بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جاؤ اور تیسری یہ کہ معاہدۂ حدیبیہ کے خاتمہ کا اعلان کر دو۔ قریش توازن تو کھو ہی بیٹھے تھے، قاصد کے ذریعے کہلا بھیجا کہ صرف تیسری شرط منظور ہے۔ بعد میں سوچا تو پچھتائے۔

قریش کے حلقۂ قیادت میں قاصد بھیجنے کے بعد سخت تشویش پھیلی، کیونکہ فوجی قوت تباہ ہو چکی تھی اور معیشت کا دامن پارہ پارہ تھا، ان کے حمایتی بہود کچلے جا چکے تھے، مدینہ کی حکومت مضبوط ہو چکی تھی، اور دور دور تک اس کی گرفت محکم تھی۔ اب تو قریش کا جو کچھ بھی بچاؤ تھا۔ معاہدۂ حدیبیہ کے ذریعے تھا۔ یہ روک بھی خود ہی ہٹا دی۔ اب گویا مدینے کو دعوت دی گئی تھی کہ آؤ اور ہم پر حملہ کر دو۔

آخر مکّے کا سب سے بڑا لیڈر ابو سفیان اس غرض کے لیے مدینے روانہ ہوا کہ معاہدے کی تجدید کرائے۔ پہلے وہ اپنی دختر ام المومنین حضرت امّ حبیبہؓ کے گھر گیا۔ بستر پر بیٹھنے لگا تو بیٹی نے لپک کر بستر لپیٹ دیا کہ یہ رسول اللہؐ کا بستر ہے اور تم مشرک ہو کر اس پر نہیں بیٹھ سکتے۔ پھر اُس نے حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم سے ملاقاتیں کیں۔ حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا کے دروازے پر بھی پہنچا۔ کہیں بات نہ بنی۔ آخر ایک صورت سوچی اور اس پر حضرت علیؓ سے مشورہ کیا اور پھر یک طرفہ طور پر اعلان کر دیا کہ

معاہدۂ حدیبیہ کی ذمہ داری قائم ہے۔ واپس مکّے پہنچ کر داستان سنائی تو لوگوں نے کہا کہ حضرت علیؓ نے تمہارے ساتھ مذاق کیا ہے۔

اِدھر انسانیت کے سچّے خیر خواہ اور مربّی اور محسن حضرت محمد مصطفیٰؐ کا اشارہ ہوا کہ سرفروشانِ جادۂ حق تیاری کریں۔ یہ کسی کو نہ بتایا کہ کدھر کا پروگرام ہے۔ حتیٰ کہ حضرت عائشہؓ کو بھی علم نہ ہو سکا۔ بعد میں جب کچھ لوگوں کو اندازہ ہو گیا تو حضرت حاطب بن اَبی بلتعہ نے مکّے میں مقیم اہل و عیال کو بچانے کے لیے قریش کو ایک خط میں مدینے کی تیاریوں کا حال لکھ دیا۔ حضورؐ کو اللہ تعالیٰ نے اس سے آگاہ کر دیا۔ یہ خط مکّے جاتی ہوئی ایک عورت کے بالوں کی چوٹی سے برآمد کیا گیا۔ حضرت حاطب کو ان کے ایمان واخلاص اور بدری صحابی ہونے کی وجہ سے معاف کر دیا گیا۔

عجیب اتفاق ہے کہ حق و باطل کا ابتدائی معرکہ بھی رمضان کے مہینے میں ہوا اور اب تکمیلی معرکہ بھی رمضان ہی میں پیش آ رہا تھا۔

۱۰ رمضان کو حضورؐ کے ساتھ دس ہزار سپاہ نے مدینے سے کوچ کیا اور قدیم نوشتوں کی وہ بات پوری ہو گئی کہ "وہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا"۔ آپؐ نے کچھ ایسے ہیر پھیر کا راستہ اختیار کیا کہ قریش کی جو گشتی پارٹی دیکھ بھال کے لیے نکلی تھی وہ کسی اور طرف گھومتی رہی۔ مسلم فوج نے یکایک مکّے کے سامنے جا پڑاؤ ڈالا۔

حضورؐ جُحفہ پہنچے تو آپؐ کے چچا عباس مع اہل و عیال زیارت کے لیے تشریف لائے۔ پھر کچھ گفتگو ہوئی۔ حضورؐ نے اپنا سفید خچر حضرت عباس کو دے کر کہا کہ ابوسفیان کو ساتھ لیتے آیئے۔

پھر مرّ الظہران کے مقام پر پہنچ کر رات کو کیمپ لگایا گیا تو فوجی مصلحت سے رسولِ برحق نے حکم دیا کہ تمام سپاہی اپنے لیے الگ الگ آگ روشن کریں۔ ابوسفیان بن حرب اور دوسرے اکابر دیکھ بھال کے لیے نکلے تو بلندی سے دس ہزار چولہوں کو روشن دیکھ کر سکتے میں آ گئے۔ حضرت عباس کا گزر ہوا۔ انھوں نے ابوسفیان سے کہا کہ محمدؐ بڑی فوج لے کر آئے ہیں، اب قریش کی خیر نہیں۔ ابوسفیان نے پوچھا کہ اب چارۂ کار کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آؤ میرے

ساتھ خچر پر بیٹھ جاؤ اور چل کر حضورؐ سے بات کریں۔ ابوسفیان کو اسلامی کیمپ میں دیکھ کر حضرت عمرؓ کا خون کھول گیا۔ حضورؐ سے قتل کرنے کی اجازت طلب کرنے گئے۔ پیچھے سے حضرت عباسؓ پہنچ گئے اور انھوں نے کہا کہ یارسول اللہ! میں ابوسفیان کو پناہ دیکر لایا ہوں۔

اگلی صبح کو ابوسفیان نے حضورؐ کے سامنے اسلام قبول کر لیا۔

حضرت عباسؓ نے حضورؐ کے ارشاد کے مطابق اسلامی لشکر کی گزرگاہ سے متصل ایک اُدنچے۔ ٹیلے پر ابوسفیان کو کھڑا کیا تاکہ وہ سارا منظر دیکھ سکے۔ فوج نے کدا کے راستے مارچ کیا۔ مختلف قبیلوں کے الگ الگ جیش ترتیب دیے گئے تھے۔ ابوسفیان ہر جیش کے متعلق کچھ پوچھتا جاتا۔ جب سعد بن عبادہ اس مقام سے گزرے تو جوش میں پکار اُٹھے: آج گھمسان کا دن ہے، آج کے دن کعبہ کے اردگرد جنگ روا ہوگی۔ حضورؐ کو اس نعرے کا علم ہوا تو فوراً اُن سے عَلَم لے لیا گیا اور اُن کے بیٹے کے سپرد کر دیا گیا۔ اس وقت حضورؐ نے فرمایا: آج کا دن کعبہ کی عظمت کا دن ہے، اور بِرّ و وفا کا دن ہے۔ لشکر کے مارچ کے ساتھ حضورؐ نے یہ اعلان فرمایا کہ جو شخص حرم میں داخل ہو جائے اسے امان ہے، جو شخص ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے اسے بھی امان ہے، جو شخص اپنے گھر میں بیٹھ رہے اسے بھی امان ہے، اور جو کوئی ہتھیار لے کر نہ نکلے اسے بھی امان ہے۔ ماسوا اس کے جو اپنے کسی جرم کی تعزیر کا سزاوار ہو۔ ابوسفیان نے اس اعلان کو مکے میں پھیلایا۔

۲۰ رمضان کو مکّے میں فاتحانہ داخلے کے وقت نہ ڈھول ڈھمکے تھے، نہ کوئی اُچھل کود، نہ کوئی متکبرانہ نعرہ بازی، بلکہ دنیا کا سب سے بڑا انسان جب فاتحِ مکّہ بن کر شہر میں داخل ہوا تو حال یہ تھا کہ حضورؐ سواری پر بیٹھے سر بہ سجدہ تھے۔ شکر تھا، کبر و فخر نہ تھا، زبان سورۂ فتح کی تلاوت میں مشغول تھی۔ کچھ قریشی سرداروں کی کوتاہیٔ بصیرت کہ انھوں نے نوجوانوں کو آمادۂ شرارت کیا اور خندمہ پہاڑ کی جانب انھوں نے دو صحابیوں کو شہید کر دیا۔ حضرت خالد کو اطلاع ملی تو انھوں نے فوراً ان کی سرکوبی کی اور ۱۲ آدمیوں کو ڈھیر کر دیا۔ ایسی ہی ایک ٹولی شہر میں بھی مزاحمت کے لیے نکلی۔ حضورؐ نے انصار کا ایک دستہ طلب کیا اور ان کو یہ منظر دکھایا کہ ایک طرف تو فاتح مسلم قوت ایک قطرۂ خون بھی بہانا نہیں چاہتی، اور دوسری طرف یہ کمینہ لوگ

ہماری نیام کردہ تلواروں کو باہر نکلنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ فرمایا کہ یہ مزاحمت کریں تو صفایا کردو۔ ابو سفیان کو اطلاع ملی تو دوڑا دوڑا آیا اور کہا: یا رسولؐ اللہ! قریش پہلے ہی تباہ ہو چکے ہیں، ایسا نہ ہو کہ ان کا نام و نشان ہی دنیا سے مٹ جائے۔ خیر وہ اشرار تھوڑی مار کھا کے فرار ہو گئے۔

حضورؐ کے اس عفو و کرم کو دیکھ کر انصار میں بعض لوگوں نے یہ چہ میگوئیاں پھیلائیں کہ آخر حضورؐ پر اپنی قوم کی محبت غالب آرہی ہے۔ اطلاع ملنے پر حضورؐ نے انصار سے خطاب فرمایا اور کہا۔ "خدا کی قسم! ایسا نہیں ہے، میں خدا کا بندہ اور رسولؐ ہوں۔ میں نے خدا کی طرف اور تمہاری طرف ہجرت کی ہے۔ اب میرا جینا مرنا تمہارے ساتھ ہے۔" انصار پر رقت طاری ہو گئی اور طالب عفو ہوئے۔ حضورؐ نے معاف فرمایا۔

لوگوں نے پوچھا کہ اب آپؐ اپنے آبائی مکان میں قیام فرمائیں گے۔ فرمایا کہ عقیل نے ہمارے لیے گھر چھوڑا ہی کہاں ہے۔ حضورؐ کا علم حجون میں نصب ہوا اور یہی قیام گاہ طے پائی۔ اس تاریخی مقام کی طرف تشریف لے گئے جہاں قبیلے کے ساتھ نظر بندی کا دور گزارا تھا۔ پھر حرم پہنچے۔ حضرت بلالؓ نے کعبے کی بلندیوں سے اذان کہی۔ حضورؐ نے حجر اسود کا استلام کیا۔ ہاتھ میں کمان لیے حرم میں نصب شدہ ایک ایک بت کے پاس جا کر پکارتے جاء الحق و زھق الباطل، ان الباطل کان زھوقا۔ قوس کے اشارے سے بت گراتے جاتے۔ پھر کعبہ کی کنجی منگوا کر دروازہ کھلوایا۔ اندر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی تصویریں بنی تھیں، اور ان کے ہاتھوں میں پانسے کے تیر دکھائے گئے تھے جو اس پاس جگہوں پر نصب تھے۔ پھر آپؐ نماز و ذکر میں مصروف رہے۔ مسجد کے سامنے ہجوم عام تھا۔ آپ نے خطاب فرمایا:

"ایک خدا کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا، اسی اکیلے نے تمام لشکروں کو شکست دی۔

آج کبر و غرور اور خون کے تمام دعوے، مالوں کے تمام مطالبے میرے قدموں کے نیچے ہیں البتہ حرم کی تولیت اور حجاج کی آب رسانی کے عہدے مستثنیٰ ہیں۔

اے قریش! اب خدا نے تمھارے جاہلیت کے غرور اور نسب کے فخر کو مٹا دیا۔ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔ سارے انسان ایک ہیں۔ تم میں سے معزز وہ ہے جو تقویٰ میں پیش پیش ہے۔"

پھر ایک قانونی اعلان کیا کہ خدا نے شراب اور اس کے خرید و فروخت کو حرام کر دیا ہے پھر سوالیہ انداز میں فرمایا کہ تمھیں کچھ معلوم ہے کہ میں تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں؟ ان الفاظ کے گونجتے ہی ظلم اور مکر اور تشدّد اور خونخواری کی وہ ساری گندی تاریخ قریش کی نگاہوں کے سامنے سے ایک فلم کی طرح گزر گئی ہوگی جسے اُنھوں نے ۲۰، ۲۱ برس میں تیار کیا تھا۔ پھر ان کی جنگی کارروائیوں کے مناظر ان کے ذہنوں کے پردوں پر تازہ ہوگئے ہوں گے۔ ان کے ضمیر پھٹ جانے کو ہوں گے۔ بے بسی اور ندامت کے عالم میں وہ پکار اُٹھے:

"تو شریف بھائی ہے اور شریف بھائی کا بیٹا۔"

جواباً آواز آئی، لا تثریب علیکم الیوم۔ اِذھبوا فانتم الطلقاء "آج تم پر کوئی گرفت نہیں۔ جاؤ تم آزاد ہو۔"

کیا قریش کی تاریخِ مکر و ظلم کو سامنے رکھ کر کوئی شخص اس جواب کی توقع کر سکتا ہے۔ مگر اس جواب نے یہ ثابت کیا کہ حضورؐ ایک دنیوی بادشاہ نہ تھے، خدا کے پیغمبر تھے۔ آپ کوئی سیاسی ارمان لے کے نہیں اُٹھے تھے، بلکہ ساری انسانیت کی تعمیرِ نو کا کام سامنے تھا۔

یہ بھی محسنِ انسانیت ہونے کی شان تھی کہ مہاجرین مکّہ سے فرمایا کہ وہ اپنے متروکہ مکانوں اور املاک سے بالکل دست بردار ہو جائیں۔ اور قریش ہی کے تصرف میں رہنے دیں۔ پھر کعبے کی کنجی قیامت تک کے لیے انھی عثمان بن طلحہ کو تفویض فرمائی جن سے ابتدائی دور میں ایک بار در کعبہ کھلوانا چاہا تو اُنھوں نے سختی سے انکار کر دیا۔ اُس موقع پر فرمایا تھا: "ایک دن آئے گا کہ یہ کنجی میرے اختیار میں ہوگی اور میں جسے چاہوں گا تفویض کروں گا۔" حضورؐ کے علاوہ کوئی دوسرا ہوتا تو واقعی آج اس کنجی کو وہ ضرور کسی اور کے حوالے کر دیتا۔ مگر حضورؐ نے تو اس کنجی کے لیے بنو ہاشم کی طرف سے حضرت علیؓ کی پیش کردہ درخواست بھی منظور نہیں کی۔ کنجی دیتے ہوئے آپؐ نے فرمایا: "آج کا دن نیکی اور وفا کا دن ہے۔"

پھر حضورؐ نے امِ ہانی کے مکان پر غسل کر کے ۸، رکعت نماز بطور شکرانۂ فتح پڑھی۔
فتح کے دوسرے روز کوہ صفا پر سے خطاب فرما کر حرم کی حرمت کو بحال کیا۔ عام معافی کے اعلان سے چند افراد مستثنیٰ تھے۔ وہ کہ جن کے جرائم نہایت درجہ سنگین تھے۔ اُن کے لیے فرمایا کہ ان کو جہاں پاؤ قتل کر دو۔ واضح رہے کہ فوجی کارروائی کے دوران میں فوجی قانون ہی کے تحت کمانڈر احکام جاری کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے زیادہ تر افراد نے معافی مانگ لی۔ تاہم شدید مجرم افراد یہ تھے:۔ (۱) حُوَیرِثُ بن نُقَیدُ بن وہب بن عبد بن قصی، (۲) مُقیس بِن حُبَابہ (۳) سارہ (بنی عبدالمطلب میں سے کسی کی لونڈی) (۴) عِکرمہ بن ابی جہل (۵) عبداللہ بن خَطَل (۶) ابنِ خَطَل کی دو موسیقارائیں (فَرتَنیِ اور اس کی ہم نوا)۔
کہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ چار افراد ایسے تھے کہ جن کے لیے موت کا فیصلہ نافذ ہوا۔ لیکن محققین نے یہ رائے بھی دی ہے کہ صرف ایک شخص عبدالعزیٰ ابنِ اَخطل کو اس کے سنگین جرائم کی وجہ سے قتل کیا گیا۔

فتح مکّہ سے متعلق واقعات واحوال کا بڑا وسیع سلسلہ ہے۔ بہت سی باتیں درکنار رہ گئیں۔ سب سے بڑی بات جو اس فتح کے متعلق کہی جاسکتی ہے کہ دنیا کی کسی اور قوت نے پچھلی چودہ صدیوں کے دوران میں ایسی فتح کی ایک مثال بھی پیش نہیں کی۔ نہ کسی کی تذلیل کی گئی، نہ کسی کے مال پر ہاتھ صاف کیا گیا، نہ کسی خاتون کے ناموس کو تاراج کیا گیا، نہ لوگوں کے حقیقی جرائم تک کا کوئی انتقام لیا گیا۔ یہ مثال صرف اُس ہستی نے پیش کی جو ساری انسانیت کی محسن ہے۔

اور پھر یہ اعلانِ مساوات کہ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں، پورے عالمِ انسانیت کی فلاح کے لیے تھا۔ ○○

تقریر ۲۸

غزوۂ حُنین و اوطاس

قریش مکّہ کی جنگی قوت کی جڑیں ملحقہ علاقے میں بنو ہوازن اور بنو ثقیف تک پھیلی ہوئی تھیں. طائف ان کا شہر تھا۔ ان کے تعلقات قریش مکّہ سے حلیفانہ تھے. معاشی طور پر بھی گہرا رابطہ تھا۔ ان حالات میں فتح مکّہ نامکمل رہتی، اگر قریش مکّہ کی جڑوں کو نہ اکھیڑ دیا جاتا۔

ہوا یہ، کہ پیغمبرِ صادق و مصدوق نے اعلیٰ درجے کی عسکری حکمتِ عملی سے کام لے کر قریش مکّہ کو اس طرح اچانک آپکڑا کہ ان کو حلیفوں سے کوئی مدد نہ مل سکی۔ اکیلے مارے گئے۔

اُدھر قبیلۂ ہوازن کے لیڈروں کو اندازہ تھا کہ معاہدۂ حدیبیہ جس سلسلۂ واقعات کے تحت ٹوٹا ہے اس کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے. سرداروں نے پہلے ہی سے جنگی قوت اکٹھی کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا اور قبائل میں دورہ کر کے مسلم قوت کے خلاف اشتعال پھیلایا۔ اب جو اُنھوں نے فتح مکّہ کی خبریں سُنی تو اپنی ساری قوت حنین یا اوطاس نامی وادی میں لا جمع کی. فی الحقیقت وہ خود جارحانہ پیش قدمی کر کے مسلم قوت پر حملہ کرنا چاہتے تھے. اس موقع پر بنی کعب اور بنی کلاب نے شرکت نہیں کی، اور یہ بہت بڑی کمی رہ گئی۔

ادھر رسولِ برحق کو جونہی اطلاع ملی، آپ نے عبداللہ بن اَبی حَدرد اسلمی کو تحقیقِ

حال کے لیے روانہ کیا۔ اُنھوں نے واپس آکر تفصیلات حضورؐ کے سامنے رکھ دیں۔

مسلم فوج کے کمانڈر (صلی اللہ علیہ وسلم) ۔نے مدینے سے بہت زیادہ اسلحہ و رسد کا انتظام نہیں کیا تھا، کیونکہ قریش کی قوت کو سامنے رکھ کر فتح مکّہ کے لیے جو منصوبہ بنایا گیا تھا وہ بس ایک مختصر معرکے کا تھا۔ ضرورت بھی زیادہ پیش نہیں آئی۔ مگر اب بنو ہوازن اور بنو ثقیف کا معاملہ سامنے آنے پر فوری انتظام حضورؐ نے یہ کیا کہ عبداللہ بن ربیعہ سے ۳۰ ہزار درہم اور مکّے کے رئیس صفوان بن امیہ سے سو زرہیں اور دیگر اسلحہ مستعار لیے۔

شوال ۸ھ کو مکّے سے ۱۲ ہزار کی تعداد میں ایک بڑا لشکر روانہ ہوا۔ بعض صحابہؓ میں اپنی تعداد کے متعلق فخر کا احساس ہوا اور یہ الفاظ بھی زبانوں پر آئے کہ "آج کون ہم پر غالب آسکتا ہے؟" خدا کو یہ بات ناپسند ہوئی اور اس کا کفارہ میدانِ جنگ میں دینا پڑا۔

تعداد تو بڑھ گئی لیکن کمزور پہلو بھی نئے تھے۔ مقدمتہ الجیش میں خالد کے زیرِ کمان نو مسلم نوجوان تھے، جنھوں نے جوشیلے پن میں پوری طرح مسلح ہونے سے بھی غفلت کی۔ پھر مکّے کے دو ہزار طلقاء تھے جو اسلامی حکومت کے مطیع تو ہو چکے تھے، اور کچھ نے اسلام بھی قبول کر لیا تھا، مگر ایسا تو نہ تھا کہ ان کے ذہن اور کردار اسلام کے سانچے میں ڈھل گئے ہوں۔ دوسری طرف مخالف فریق کی وجہِ فوقیت یہ تھی کہ وہ زبردست جنگجو اور تیر پھینکنے میں قادر انداز تھے۔ نیز اُنھوں نے پہلے سے میدانِ جنگ میں اپنے لیے بہتر جگہ حاصل کر لی تھی اور ٹیلوں اور پہاڑیوں میں اپنے دستے پھیلا دیے تھے۔

ادھر مسلم فوج صبح سے ذرا پہلے حُنَین پہنچی اور ایک وسیع وادی کے ڈھلوان میں اترنا شروع کیا تو دشمن سپاہ نے کئی اطراف سے یکایک پر زور حملہ کر دیا۔ مسلم لشکر میں انتشار پھیل گیا اور مجاہدین پیچھے کو پلٹے۔ حتیٰ کہ ایک دوسرے کو مڑ کر دیکھنے کی بھی کسی کو مہلت نہ تھی۔ اس افراتفری کے عالم میں حضورؐ کا غیر معمولی کردار نمایاں ہوتا ہے کہ آپؐ سواری سے اُتر کر ایک طرف کھڑے پکار رہے تھے کہ "لوگو کدھر جاتے ہو؟ ادھر میرے پاس آؤ، میں اللہ کا رسولؐ اور محمد بن عبداللہ ہوں۔" پھر آواز دی کہ:

انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب

بس تھوڑے سے مہاجرین، چند انصار اور آپؐ کے گھرانے کے لوگ آپؐ کے پاس کھڑے رہے۔ حضرت عباسؓ نے آواز دی۔ یا معشر الانصار! یا اصحاب الشجرہ! اتنا سننا تھا کہ مسلمان ہر طرف سے لپکے اور اپنے مرکزِ شجاعت کے گرد جمع ہو گئے! پھر جو لڑے تو آناً فاناً رنگ بدل گیا۔ دشمن کے ۰۷ آدمی مارے گئے اور جب ان کا علمبردار ہلاک ہو گیا تو ان کے قدم اکھڑ گئے۔ شکست خوردہ فوج کا ایک حصہ قلعۂ اوطاس میں جا چھپا۔ ابو عامر اشعری نے مختصر سا دستہ ساتھ لے کر کئی ہزار دشمنوں کے خلاف معرکہ آرائی کی۔ خود شہید ہو گئے لیکن ان کا دستہ کامیاب رہا۔

دوسرا نشانہ طائف تھا۔ طائف بڑا ہی محفوظ مقام تھا۔ اس کے گرد فصیل موجود تھی۔ اور اس کی تازہ مرمت کی گئی تھی۔ سال بھر کا سامانِ رسد جمع تھا۔ اسلحہ وافر تھا۔ طائف پر حضورؐ نے ایسے رُخ سے حملہ کیا جدھر سے اہلِ طائف کو گمان بھی نہ گزرا ہوگا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ قلعہ شکنی کے لیے مسلم فوج نے منجنیق اور دبابے استعمال کیے۔ فصیل کے اندر سے مسلمانوں پر ناوک اندازی بھی شدت سے ہوتی رہی اور قلعہ شکن آلات کو نقصان پہنچانے کے لیے گرم آہنی سلاخیں بھی برسائی گئیں۔ مجبوراً فوج کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

حضورؐ نے نوفل بن معاویہ سے مشورہ طلب کیا۔ پھر فیصلہ یہ کیا کہ چونکہ طائف اسلام کے زیرِ نگیں آئے ہوئے عرب کے درمیان ایک جزیرۂ اختلاف بن کر نہیں رہ سکتا اس لیے اگر اُسے اِس وقت چھوڑ دیا جائے تو طرفین کا نقصان کم ہوگا اور بعد میں اہلِ طائف نئے حالات کے زیرِ اثر رضاکارانہ جذبے سے اسلام قبول کریں گے۔

اُحد کی طرح اس غزوہ کے سخت مراحل میں بھی حضورؐ سے چاہا گیا کہ دشمن کے لیے بددُعا کریں۔ مگر آپؐ نے یہ دُعا کی: "اے اللہ تو ثقیف کو راستی کی ہدایت دے؛ اور ان کو ہمارے ساتھ ملا دے"۔

اس غزوہ کے بعد جعرانہ میں بے شمار مالِ غنیمت جمع تھا۔ ۲۴ ہزار اونٹ ۴۰ ہزار بکریاں، ۴ ہزار اوقیہ چاندی۔ اس مال میں سے پانچواں حصہ مقررہ مدات کے لیے بیت المال میں رکھ کر بقیہ فوج میں تقسیم کر دیا گیا۔

قرآن نے تالیف قلب کی جو مد رکھی ہے اس کے تحت حضورؐ نے مکّے کے باشندوں اور لیڈروں کو دل کھول کر بہت سا مال دیا۔ مقصود یہ تھا کہ ان کے زخموں پر مرہم رکھا جائے۔ اُن سے زیادہ حرماں نصیب اُس وقت آسمان کے نیچے اور کون رہا ہوگا۔ وہ سرورؐ عالم کے قرابت دار ہوتے ہوئے پچھلی صفوں میں سٹے سکڑے کھڑے تھے اور انصار اور مہاجرین حضورؐ کے دست و بازو بنے ہوئے تھے۔ کیا سماں ہوگا جب مکّے کے وہ لیڈر جو پروں پر پانی نہ پڑنے دیتے تھے، آج اُس ہستی کے ہاتھ سے عطیات وصول کر رہے تھے جس کے ساتھ ہر زیادتی مکّے میں روا رکھی گئی تھی۔

انصار نے جب دریائے کرم کو قریش کے حق میں اس طرح اُمڈتے دیکھا تو ان کے بعض عناصر بہ تقاضائے بشریت ادنیٰ جذبات کی لپیٹ میں آ گئے۔ یعنی یہ کہ کہیں حضورؐ نسلی اور وطنی تعلّق کی بنا پر تو قریش کو نہیں نواز رہے ہیں۔ کسی نے یہ تک کہہ دیا کہ حق کی حمایت میں جانیں ہم لڑاتے ہیں، اور اس وقت بھی ہماری تلواروں سے خون ٹپک رہا ہے، لیکن داد و دہش کے وقت قریش کیوں مقدم ہو جائیں!

انسان بہ ہر حال انسان ہیں، کبھی نہ کبھی کوئی لمحہ ایسا آجاتا ہے کہ کوئی ناموزوں خیال یا جذبہ قلب و ذہن سے آگزرتا ہے۔ بُرے لوگ غلط خیالات کو پکڑ کے بیٹھ جاتے ہیں، اچھے لوگ جونہی حقیقت سمجھتے ہیں، ناپسندیدہ جذبات و احساسات کو اپنے ہاں سے چلتا کرتے ہیں، حضرت سعد بن معاذ کے ذریعے بات حضورؐ کے کانوں تک پہنچی۔ حضورؐ نے ایک شامیانہ لگوایا۔ انصار کو جمع کیا گیا اور ان کے سامنے دل ہلا دینے والی تقریر کی۔

اے گروہِ انصار! آخر یہ کیا چہ میگوئیاں ہیں جن کی سُن گن مجھے لگی ہے۔ یہ کیا احساسات ہیں جو تم میرے بارے میں اپنے اندر پاتے ہو۔ کیا تم گمراہ نہ تھے۔ اور میرے ذریعے اللہ نے تم کو ہدایت دی؟ تم تنگ دست تھے اور اللہ نے تم کو کشائش دی، تم آپس میں دشمن تھے اور اللہ نے تمھارے دلوں کو جوڑ دیا۔

پھر تقریر کا دھارا پلٹتا ہے:۔ فرمایا!

بجائے اس کے، خدا کی قسم، تم یہ کہہ سکتے ہو اور تمھارا یہ کہنا ٹھیک ہوگا کہ تم ہمارے

پاس آئے جبکہ تمھیں دوسروں نے جھٹلا دیا اور ہم تھے جنھوں نے تمھاری تصدیق کی۔ تم بے یار و مددگار آئے اور ہم نے تمھاری مدد کی، تم وطن سے نکالے ہوئے ہمارے پاس آئے اور ہم نے تم کو جگہ دی، اور تم ہمارے پاس تہی دست آئے۔ اور ہم نے تمھیں سب کچھ دیا۔" پھر دوسرے پہلو سے بات کی۔

"اے معشر انصار! کیا تم اپنے دلوں میں اس متاعِ دنیا کا شوق رکھتے ہو جسے میں نے اس خیال سے گروہ قریش کو دیا کہ وہ اطاعت کا راستہ اختیار کریں، اور میں نے انھیں تمھاری طرف سے دین اسلام تک لانے کی کوشش کی ہے۔"

"اے معشر انصار! کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ لوگ بکریاں اور اونٹ لے جائیں اور تم خدا کے رسول صلعم کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔

قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار میں ایک شخص ہوتا۔ اگر تمام لوگ ایک وادی میں جانا پسند کریں اور انصار دوسری وادی میں تو میں انصار کی پسندیدہ وادی میں جاؤں گا۔

یا اللہ! انصار پر اور انصار کے بیٹوں پر اور آگے ان کی اولادوں پر رحم فرما!"

اس تقریر نے انصار کو تڑپا دیا۔ لوگ اس طرح رو رہے تھے کہ داڑھیاں آنسوؤں سے بھیگ گئیں اور انصار چیخ اٹھے کہ ہم اپنے حصے میں رسول صلعم کو لے کر راضی ہیں۔

ادھر ۶ ہزار اسیرانِ جنگ قسمت کے فیصلے کے منتظر تھے۔ حضور پورے ۲ ہفتے تک منتظر رہے کہ کوئی آکر ان کے متعلق بات کرے۔ کوئی نہ آیا تو ان کو سپاہ میں تقسیم کر دیا گیا تاکہ ہر قیدی کا انتظام ہو جائے۔ تقسیم ہو چکنے کے بعد حلیمہ سعدیہ کے قبیلے کے معززین کا وفد آیا۔ زہیر بن ابی صرد نے حضور کی خدمت میں بڑی پرسوز مؤثر تقریر کی:

"جو عورتیں چھپروں میں محبوس ہیں، ان میں تیری پھوپھیاں ہیں، ان میں تیری خالائیں ہیں۔ اگر سلاطین عرب میں سے کسی نے ہمارے خاندان میں دودھ پیا ہوتا تو ان سے بہت کچھ امیدیں ہوتیں۔ تجھ سے ہمیں اور بھی

زیادہ توقعات ہیں۔"

حضورؐ نے وضاحت کی کہ میں تو خود منتظر رہا کہ کوئی آکر بات کرے۔ مگر اب جب کہ تقسیم ہو چکی ہے، بنو ہاشم کے قیدی تمھیں واپس کرتا ہوں۔ باقیوں کے لیے نماز کے بعد بات کرنا۔ نماز کے بعد زہیر نے مجمع کے سامنے پھر بات کی۔ آپؐ نے فرمایا: "مجھے صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے۔ البتہ میں تمام مسلمانوں سے سفارش کرتا ہوں۔" فوراً مہاجرین و انصار بول پڑے کہ ہمارا حصہ بھی حاضر ہے۔ صرف بنی سُلیم اور بنی فزارہ نے ایسا نہیں کہا۔ آخر حضورؐ نے ان کو ۶ اونٹ فی قیدی فدیہ میں دے کر تمام قیدی رہا کرا دیے۔ متعدد قیدیوں کو رخصت کرتے ہوئے اپنے پاس سے کپڑے بھی دیے۔

رسولؐ خدا چاہتے تو تمام مسلمانوں کو حکم دے سکتے تھے۔ مگر آپؐ نے کبھی اقتدار کو اپنے ذاتی رجحانات کے تحت استعمال نہیں کیا اور نہ مسلمانوں سے ان کے حقوق کبھی سلب کیے۔ اس موقع پر بھی سفارش ہی کی۔

حضورؐ کی سفارش کو بھی جن دو گروہوں نے نہ مانا، ان کے خلاف نہ ناراضگی ظاہر کی نہ کارروائی کی، نہ دل میں کوئی تکدر رہا!

ان معاملات سے فارغ ہو کر حضورؐ نے مکے سے واپسی کا قصد کیا اور عَتّاب بن اُسید کو مکّہ کا گورنر مقرر کرتے ہوئے ایک درہم روزانہ ان کی تنخواہ مقرر فرمائی۔ ؎

تقریر ۲۹

فتحِ مکّہ و حُنَین کے بعد

فتحِ مکّہ و حُنَین کے بعد فی الحقیقت اسلامی انقلاب کی مخالف قوّت کا سر کچلا جا چکا تھا۔ کہیں کہیں بچے کھچے شرپسند عناصر کی محدود سی حرکات کو دبانے کے لیے چھوٹی چھوٹی کارروائیاں کی گئیں۔

قبیلۂ بنو تمیم، قبیلۂ خَثعم، قبیلۂ بنو کلاب اور جدہ میں حبشہ سے آئے ہوئے ڈاکوؤں کے معاملے میں مہمات بھیجی گئیں۔

ربیع الآخر ۹ھ میں حضرت علیؓ کو قبیلۂ بنی طے میں ڈیڑھ سو سواروں کے ساتھ بھیجا گیا۔ حکم یہ تھا کہ وہاں کے بڑے صنم خانے کو ڈھا دیں۔ مدینے کی اعتقادی اور مقصدی ریاست عقیدہ و مذہب کی انفرادی آزادی تو غیر مسلموں کو دے سکتی تھی، مگر وہ ایسے مظاہر اور ایسے اداروں کا وجود گوارا نہ کر سکتی تھی جو اس کی بنیادوں سے ٹکراتے ہوں۔ انھی بُتوں کی عقیدت کی رَو میں لوگ مشتعل ہو ہو کر لڑائیاں لڑتے اور شر انگیزیاں کرتے تھے۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ جاہلی بُت خانوں اور مشرکانہ نظامِ اعتقاد کو ایک متوازی قوت کی حیثیت سے چلنے دیا جاتا۔ یہ بُت دراصل ایک باطل نقشۂ زندگی کی علامت قرار پا چکے تھے اور اس علامت کا نقش مٹا

دینا ضروری تھا۔ قبیلۂ طے بُت پرستانہ جذبات سے بدمست ہو کر مدینے پر چڑھائی کرنا چاہتا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ عدی بن حاتم نے اسی مقصد کے لیے سواری اور اسلحہ کا انتظام کیا تھا۔

بہرحال حضرت علیؓ نے قُلس کے مقام پر پہنچ کر علی الصباح حملہ کیا۔ عدی بن حاتم بھاگ گیا، قبیلے والوں نے معمولی مزاحمت کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔ بُت خانہ توڑ دیا گیا۔ قیدی اور جانور اور اسلحہ مسلمانوں کے قبضے میں آئے۔ قیدیوں میں عدی بن حاتم کی ضعیف العمر بہن بھی تھیں۔ انھوں نے حضورؐ سے اپنی بے چارگی کا حال بیان کر کے رہائی کی درخواست کی۔ حضورؐ نے ان کے لیے سواری کا انتظام کیا اور آزاد کر کے واپس کر دیا۔ انھوں نے بھائی کو جا کر بتایا کہ میں تو مدینے میں تیرے باپ حاتم کی سی فیاضی کے مناظر دیکھ کے آئی ہوں۔ لڑنے کا خیال چھوڑ اور جا کر فیض حاصل کر۔

جلد ہی عدی بن حاتم نے مدینے آ کر اسلام قبول کیا۔

تقریر ۳۰

غزوۂ مؤتہ اور تبوک

انسانیت کے عظیم محب و محسنؐ نے جب اپنی دعوت و تحریک کے بین الاقوامی دور کا آغاز کیا تو ایک سفیر حارث بن عمیر ازدی کو شام یا بصریٰ کی طرف روانہ کیا۔ اسے ہرقل کے نائب حاکم شرحبیل بن عمرو غسانی نے راستے میں قتل کر دیا۔ یہ بنیادی انسانی اخلاق اور سفیروں کے مسلمہ حقوق کے خلاف تھا۔ ایسی حرکات کو اگر کوئی حکومت چپ چاپ سہار لے تو پھر اس کا کوئی وزن باقی نہیں رہتا۔

غزوۂ مؤتہ پہلے ہو چکا تھا جس کی تفصیل یہ ہے کہ جمادی الآخر ۸ھ ہجری کو زید بن حارثہ کی کمان میں تین ہزار سپاہ حضورؐ نے تفویض کر کے انھیں شام کے علاقہ بلقار کی طرف روانہ کیا۔ اس فوج کو حضورؐ بہ نفسِ نفیس الوداع کہنے کے لیے مدینے کے باہر تک گئے۔

یہ فوج جب معان نامی ایک مقام پر پہنچی تو معلوم ہوا کہ ان دنوں ہرقل دورے پر آیا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ بہت بڑی فوج ہے۔ اور بنی لخم، بنی جذام اور بہراء کے عیسائی جمع ہیں۔ مجموعی تعداد کا اندازہ ایک لاکھ تھا۔ فوجی افسروں نے مشورے کے بعد طے کیا کہ دشمن کی قوت کو دیکھ کر واپس نہیں جائیں گے۔ آگے بڑھیں گے۔ مشارف کے مقام پر پہنچے تو دشمن

کی بہت بڑی فوج موجود تھی۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ زید بن حارثہ شہید ہوئے۔ علم حضرت جعفر نے سنبھالا، دونوں ہاتھ کٹ گئے اور ۹۰ زخم کھاکر وہ بھی اپنے فرض کی تکمیل کر گئے۔ عبداللہ بن رُواحہ نے علم سنبھالا، مگر وہ بھی شہید ہو گئے۔ آخر حضرت خالد بن ولید بڑھے اور اس بے جگری سے لڑے کہ ۹ تلواریں ان کے ہاتھ میں ٹوٹیں۔ آخر دشمن کی فوج پیچھے ہٹی۔ مسلم فوج کی ۱۲ قیمتی شخصیتیں شمع اسلام پر نثار ہو گئیں۔

تھوڑی سی فوج، غیر علاقہ، نہ کمک نہ رسد، اسی ایک کامیاب معرکے کے بعد یہ مہم واپس آگئی۔ اسی موقع پر حضرت خالد کو سیف اللہ کا خطاب دیا گیا۔

یہ تھا معرکۂ مُوتہ! اور اس کی دوسری کڑی تھا غزوۂ تبوک!

غزوۂ تبوک بہت سے وجوہ سے اسلامی تاریخ اور سوانح نبوت کا بڑا اہم باب ہے۔

فتح مکہ کے بعد رجب ۹ھ میں اطلاع پہنچی کہ قیصر کی فوجیں مدینے پر حملہ کرنے کے لیے شام میں تیار ہو رہی ہیں۔ قیصر ایک بڑی سلطنت کا فرماں روا تھا اور قریب ہی میں اس نے ایران جیسی حکومت کو شکست دی تھی۔ اِدھر محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں ساری وقعت ایمان و اخلاق کی روشنی پھیلانے والے اس مینار کو حاصل تھی جو مدینے میں کھڑا جگمگا رہا تھا۔ آخر حضورؐ کی مسلم جماعت سالہا سال کی قربانیوں کے اس ماحصل کے نقصان کو کیسے گوارا کر سکتی تھی۔ فیصلہ ہوا کہ قیصر کی فوج کو عرب میں گھسنے نہ دیا جائے، اور اس سے ملک سے باہر ہی جنگ کی جائے۔ فوراً جنگی تیاری شروع ہو گئی۔ سخت گرمی کا موسم تھا۔ قحط اور عسرت کا عالم تھا۔ حضورؐ نے جنگی ضرورت سے چندے کی اپیل کی۔ اس اپیل کا ایسا قابلِ یادگار جواب مسلم جماعت نے دیا کہ اس کے تصور ہی سے انسانیت کی روح شاداب ہوتی رہے گی۔ حضرت عثمان نے ۹ سو اونٹ اور ایک سو گھوڑے سازوسامان سے آراستہ پیش کیے، نقد چندہ کے طور پر ایک ہزار دینار حاضر کر دیے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے ۴۰ ہزار درہم لا کے ڈھیر کر دیے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے مال کا نصف یا بیشتر حصہ چندے میں دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ گھر کا سارا اثاثہ اُٹھا لائے اور مقابلۂ انفاق میں بازی لے گئے۔ لیکن شاید اور بھی زیادہ اُونچا درجہ اُس غریب محنت کش انصاری کو ملا ہوگا

جس نے دن بھر پانی کے ڈول کھینچ کھینچ کر ۴ سیر چھوہارے کمائے تھے اور دو سیر چھوہارے اہل وعیال کے لیے رکھ کر بقیہ حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ان چھوہاروں کو اموال کے سارے ڈھیر پہ بکھیر کر رکھو۔ خواتین نے جہاد فنڈ میں اپنے زیورات دیے۔ آخر ۳۰ ہزار سپاہی، دس ہزار گھوڑوں کے ساتھ روانہ ہوئے اس فوج کو جیش عسرت کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ یہ زمانۂ عسرت میں روانہ ہوئی۔ ثینۃ الوداع میں دستوں کو ترتیب دیا گیا۔ کمانڈر مقرر کیے گیے اور علَم تقسیم کیے گیے۔

تبوک پہنچے تو معلوم ہوا کہ دشمن نے عرب پر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ دراصل حکامِ شام کو کسی نے غلط خبر دی کہ حضورؐ کا انتقال ہو گیا ہے، اور حملہ کے لیے یہ بہترین وقت ہے۔ اب جب معلوم ہوا کہ نبیؐ بھی زندہ ہے اور مدینہ بھی زندہ ہے تو ان کے عزائم پر اوس پڑ گئی۔

تاہم حضورؐ نے تبوک میں ایک مہینے تک کیمپ قائم رکھا۔ اس دوران میں کئی کام انجام پائے۔ ایلہ کا حاکم پیش ہوا اور جزیہ دے کر مصالحانہ تعلقات کا آغاز کیا۔ جربا اور اذرح کے لوگ بھی جزیہ ساتھ لے کر پیش ہوئے۔ حضرت خالد بن ولید کو دومۃ الجندل کے حاکم اُکیدر کی طرف چار سو سپاہیوں کے ساتھ بھیجا گیا۔ اکیدر کا بھائی مارا گیا اور وہ خود قیدی بن کر پیش ہوا۔ جزیہ پر اس سے مصالحت ہوئی۔ پورے شمالی علاقے میں مسلم قوت کی دھاک بیٹھ گئی۔

حضورؐ واپس مدینے پہنچے تو بہت پُرجوش طریق سے استقبال کیا گیا۔

اس مشکل غزوے سے بچنے کے لیے ۸۰ سے زائد منافقین مدینے ہی میں بیٹھے رہے۔ حضورؐ نے واپس آکر اُن سے باز پرس کی تو انھوں نے جھوٹے عذر گھڑ کر بیان کیے۔ حضورؐ سب کچھ جانتے ہوئے درگزر کرتے گئے۔ لیکن کچھ اہل اخلاص بھی ایسے تھے جن سے کوتاہی ہو گئی۔ ایک مثال ابو خیثمہ کی ہے۔ یہ فوج میں شامل ہونے سے رہ گئے۔ بعد میں ایک دن شدید گرمی کے وقت ٹھنڈی چھاؤں میں بیویوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ کھانے پینے کا انتظام تھا۔ یکایک انھیں خیال آیا اور ازواج سے انھوں نے کہا

کہ" ہائیں! رسول اللہ تو دھوپ اور لو میں سفرِ جہاد کر رہے ہوں اور ابوخیثمہ ٹھنڈی چھاؤں میں حسین بیویوں کے ساتھ بیٹھا مزے دار کھانے کھا رہا ہو" یہ کہہ کر اونٹ تیار کرایا اور سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ بہت دور جا کر لشکر سے ملے۔ ان کے علاوہ تین اصحاب ایسے تھے کہ یہ نہیں سستی میں پڑے رہ گئے۔ حضرت کعب بن مالک سے حضورؐ نے سوال کیا کہ تم کیسے رہ گئے؟ انھوں نے کہا کہ یارسول اللہ میں آپؐ کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ یہی خیال کرتا رہا کہ صبح جاتا ہوں، شام کو نکلوں گا، اور اس طرح دن گزر گئے۔ ہلال بن اُمیہّ اور مُرارہ بن رَبیع نے بھی اسی طرح کوتاہی کا اقرار کیا۔ حضورؐ نے حکمِ الٰہی کے آنے تک ان کو جماعتی زندگی سے الگ اور بیویوں سے بے تعلّق رہنے کا حکم دیا۔

ان تینوں نے رضاکارانہ طور پر حکمِ رسولؐ کو اپنے اوپر نافذ کرنے کی ایسی مثال قائم کی کہ وہ ساری اُمت کے لیے ہمیشہ روشنی دیتی رہے گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم تو کجا، کوئی مسلمان ان سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ اس مرحلۂ آزمائش میں غسانی حاکم کا خط حضرت کعب بن مالک کو موصول ہوا۔ اس نے لکھا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمھارے آقا نے تم پر جفا کی ہے۔ تم بڑے قابلِ قدر آدمی ہو۔ ہمارے پاس چلے آؤ۔ ہم تمھارا مرتبہ بڑھا دیں گے۔ حضرت کعب نے خط کو تنور میں ڈال دیا۔

آخر ۵۰ دن بعد وحیٔ الٰہی نے ان کی توبہ قبول کی۔ مدینے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مبارک سلامت کی صدائیں گونجنے لگیں۔ حضرت کعب بن مالک نے قبولیتِ توبہ کی خوشی میں اپنے مال کا ایک بڑا حصّہ صدقہ کر دیا۔

یہ تھا نمونۂ انسانیت جو محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک کو مطلوب تھا!

اس غزوہ کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ اس کے دوران میں اس نوجوان نے شہادت پائی جو اپنی طرز کا ایک خاص روشن کردار تھا۔

یہ تھے عبداللہ ذوالبجادین۔

نوعمری ہی میں اسلام کی دعوت اُن تک پہنچی۔ دل متاثر ہو گیا۔ مگر چچا قبولِ اسلام میں مانع تھا۔ آخر جب فتح مکّہ سے حضورؐ واپس آئے تو نوجوان اپنے چچا سے کہنے لگا کہ:

"پیارے چچا! مجھے برسوں انتظار کرتے گزر گئے کہ کب آپ کے دل میں اسلام کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ لیکن آپ کا حال جوں کا توں ہے۔ اب تو مجھے اجازت دیجیے کہ میں اسلام قبول کر لوں۔"

سنگ دل چچا نے جواب دیا کہ اگر تم کو محمدؐ کا ساتھ دینا ہے تو میں نہ صرف تم کو اپنے سارے مال سے محروم کرتا ہوں، بلکہ تن پر کپڑا بھی نہ رہنے دوں گا۔ عبداللہ نے کہا: "چچا! آپ جو چاہیں کریں، میں تو اب بُت پرستی سے بیزار ہو چکا ہوں، اور اب میں ضرور مُسلم بنونگا۔ آپ اپنا سارا مال لے لیجیے۔" یہ کہہ کر بدن سے کپڑے اتار دیے، اور برہنگی کی حالت میں ماں کو آواز دے کر کہا کہ میں نے توحید کو قبول کر لیا ہے اور محمدؐ کی خدمت میں جانا چاہتا ہوں۔ مجھے تن ڈھانکنے کو کچھ دیجیے۔ ماں نے ایک کمبل دیا۔ پھاڑ کر آدھے کا تہ بند بنایا اور آدھا اوڑھ لیا۔ اسی حالت میں مدینے پہنچا، حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اصحابِ صفہ میں داخل ہوا۔

یہ انقلابی نوجوان شوقِ جہاد اور شوقِ شہادت میں حضورؐ کے ساتھ تبوک روانہ ہوا۔ وہاں بخار آنے سے انتقال ہوا۔ رات کی تاریکی میں تدفین ہوئی۔ حضرت بلال چراغ اُٹھائے ہوئے تھے، نبیؐ اکرم خود قبر میں اُترے، ابوبکرؓ و عمرؓ ساتھ دے رہے تھے۔ ان سے فرمایا!
"اپنے بھائی کا ادب ملحوظ رکھو۔" حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے اینٹیں رکھیں۔ پھر دُعا کی۔ "الٰہی! آج کی شام تک میں اس سے راضی ہو رہا ہوں تو بھی اس سے راضی ہو جا۔"
یہ سماں دیکھ کر حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: "کاش اس قبر میں مجھے دفن کیا گیا ہوتا۔"

تقریر ۳۱

غزوۂ تبوک کے بعد کے دو اہم واقعات

رسولِ برحق، محسنِ انسانیت، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوۂ تبوک پہ روانہ ہونے سے قبل چند اشخاص نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہم نے ضعیف اور معذور لوگوں کی سہولت اور خصوصاً بارشوں کے دنوں کے لیے مسجد قبا کے نزدیک محلہ بنی سالم بن عوف میں ایک مسجد تعمیر کی ہے، حضورؐ چل کر اس میں نماز پڑھائیں تاکہ افتتاح ہو جائے۔ اُس وقت چونکہ حضورؐ کی ساری توجہ غزوۂ تبوک پر لگی تھی، اس لیے فرمایا کہ غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد دیکھیں گے۔

یہ مسجد ۱۲ منافقین کے ایک گروہ نے تیار کی تھی جن کو پٹی پڑھانے والا ابو عامر تھا۔ اس نے سازش کے طور پہ اپنے جتھے سے کہا کہ جس قدر ممکن ہو، قوت اور اسلحہ جمع کرو، میں قیصر کے پاس جاتا ہوں اور وہاں سے ایک فوج لا کر محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کو مدینے سے نکلواتا ہوں۔ اس نے منافق جتھے کو یہ بھی کہا کہ میں اپنے متعلق ساری اطلاعات تم کو کسی نہ کسی ذریعے سے پہنچاتا رہوں گا۔ مگر تم ایک مسجد تعمیر کر رکھو جس میں میرا بھیجا ہوا خبر رساں ایک مسافر کی حیثیت سے رہ سکے اور کسی کو اس پہ شبہ بھی نہ ہو۔

حضورؐ تبوک سے واپسی پہ جب مقام ذی اُوان پر پہنچے جو مدینے سے ایک گھنٹے

کی مسافت پر تھا، اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو بذریعہ وحی مسجدِ منافقین کے بانیوں کی نیت سے آگاہ کر دیا۔ اس موقع پر حضورؐ نے دو معزز رفیقوں کو بُلا کر حکم دیا کہ جاؤ اور منافقین کی تعمیر کردہ مسجد کو منہدم کر کے تمام سامان کو آگ لگا دو۔ دونوں حضرات نہایت عجلت سے محلہ بنی سالم بن عوف میں پہنچے اور مسجد کو گرا کر سامان کو آگ لگا دی۔ اس مسجد کے متعلق وحیٔ الٰہی کے الفاظ بڑے سخت ہیں:

"جن لوگوں نے مخالفت کے اڈے کے طور پر مسجد بنائی، اسے اہلِ ایمان میں کفر پھیلانے اور تفرقہ ڈالنے کا ذریعہ بنانا چاہا اور اسے اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف لڑنے والوں کے لیے ایک کمین گاہ کی حیثیت دی۔"

ساتھ ہی حضورؐ کو حکم دے دیا گیا کہ:

"اس میں تم کبھی جا کر قیام نہ کرنا۔"

اُصولی بات اس واقعہ سے یہ سامنے آئی کہ مسجد کا ڈھانچہ بنا دینے سے کوئی عمارت تقویٰ اور پاکیزگی کا مرکز نہیں بن جاتی، بلکہ اسے بنانے اور اس کا انتظام کرنے والوں کے عزائم کے مطابق وہ نتائج دے گی۔ نیز مساجد کو نہ صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت اور کفر پھیلانے کی مساعی سے پاک ہونا چاہیے، بلکہ انھیں مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کا ذریعہ بھی نہیں ہونا چاہیے۔

دوسرا واقعہ نظامِ زکوٰۃ کے قیام کا اقدام تھا:

ہجرت کے نویں سال محرم کا چاند ہوا ہی تھا کہ اس کے ساتھ ہی ساری انسانیت کے خیر خواہ محسنؐ نے ملک بھر میں زکوٰۃ کی منظم وصولی کا انتظام قائم کر دیا۔ یہ مہینہ گویا تنظیمِ زکوٰۃ کی یاد تازہ کرنے کا مہینہ بھی ہے۔

دور و نزدیک کے مختلف قبائل کی طرف بھیجنے کے لیے اپنے نمائندے نامزد فرمائے جو اصطلاحاً محصّلینِ زکوٰۃ کہلائے۔ آج کی زبان میں ہم ان کو اموالِ زکوٰۃ کے تحصیلدار بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان تمام افسروں کو جمع کر کے حضورؐ نے یہ ہدایت دی کہ لوگوں کے اموال میں سے بہترین اور مرغوب ترین چیزیں حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں۔

یہاں یہ اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ اسلامی ریاست جو خدا پرستانہ بنیادوں پر قائم ہوتی ہے۔ وہ مَعاد کے ساتھ معاش کی فکر بھی کرتی ہے۔

دلوں کی پاکیزگی کے ساتھ عوام کے پیٹ بھرنے کا اہتمام بھی کرتی ہے۔ جس طرح آج معاش بلا مَعاد یا دنیا بلا عقیدۂ آخرت یا اقتدار بغیر خدائی ہدایت کے، ہزار مصیبتوں کا باعث ہے، اسی طرح معاملاتِ دنیا سے بے تعلق کر دینے والی عبادت گزاری، اور فکرِ معاش سے غافل کر دینے والی خدا پرستی بھی آدمی کو غیر متوازن بنا کر رہبانیت میں مبتلا کرتی ہے جسے اسلام سندِ قبولیت نہیں دیتا۔

اسلام کی ابتدائی دعوت جب حضورؐ نے شروع کی تو توحید اور صلوٰۃ کے ساتھ مساکین کو کھانا کھلانے کی تلقین کی۔ صلوٰۃ کے ساتھ شروع ہی سے صدقہ شامل رہا ہے۔ بعد میں صدقہ و انفاق کی ایک خاص نوعیت، یعنی ایتائے زکوٰۃ کو فرض کر دیا گیا اور اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ ایتائے زکوٰۃ کا حکم دیا جاتا رہا۔

لیکن ایتائے زکوٰۃ کو محض لوگوں کی رضا کارانہ ایمانی اسپرٹ پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ معاملہ چونکہ پوری جماعت کے محتاجوں اور معذوروں کی کفالت کا تھا، اس لیے سرکاری انتظام سے اس کی وصولی کا باقاعدہ سسٹم قائم کر دیا گیا۔ اس کا نصاب اور اس کی شرح مقرر کی گئی تاکہ ہر سال خوشحال لوگوں کی طرف سے ایک بڑی مقدارِ نقد و جنس معاشی طور پر کمزور لوگوں کی طرف منتقل ہوتی رہے۔

دراصل اسلامی معاشرے کا سارا ڈھانچہ نظامِ اخوت پر مشتمل ہے۔ اور اسلامی معیشت کو ہم "اقتصادی اخوت" کا نام دے سکتے ہیں۔ یہ نظام نہ تو سرمایہ داری کی طرح از خود ایک خاص شکل اختیار کرتا گیا تھا کہ چند بیلیں ہیں جو اگتی بڑھتی ہیں اور آس پاس کی ساری نباتات پر لپٹ جاتی ہیں۔ اور نہ یہ سوشلزم کی مانند تھا کہ غریبوں کے طبقے نے خوش حال لوگوں کے خلاف پورے کینہ و نفرت کے ساتھ حقوق کی لڑائی لڑ لڑ کر انقلاب برپا کیا ہو۔ بلکہ یہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والے یا گر پڑنے والے لوگوں کو سہارا دینے کا ایک انتظام تھا جس کی روح جذبۂ اخوت تھی۔

زکوٰۃ کے یک جا جمع ہو کر سرکاری انتظام سے مستحقین تک پہنچنے میں یہ مصلحت بھی تھی کہ زکوٰۃ لینے والے پوری شانِ خودداری کو قائم رکھتے ہوئے یہ سمجھ کر زکوٰۃ لیں کہ یہ ان کا حق ہے اور دینے والے بھی اسی جذبے سے دیں کہ اُن کے زائد اموال میں درحقیقت دوسرے کمزور انسانوں کا حصہ اللہ تعالیٰ نے شامل کر دیا ہے جسے ادا ہونا چاہیے۔ نظامِ زکوٰۃ قائم ہو جانے پر زکوٰۃ کے محصلین مختلف اطراف میں پھیل گئے۔

وصولیِ زکوٰۃ کے سلسلے میں ایک جگہ ناگوار صورت پیش آئی۔ حضرت بشر بن سفیان عدوی کو بنو تمیم کی طرف سے مزاحمت پیش آئی۔ وہ کہنے لگے کہ "خدا کی قسم یہاں سے ایک اُونٹ بھی نہ جائے گا۔" حضرت بشر واپس آ گئے۔ حضورؐ کو یہ حالات معلوم ہوئے تو حضرت عُیینہ بن حصن فزاری کو پچاس سواروں کے ساتھ بنو تمیم کی طرف روانہ کیا۔ یہ لوگ جُحفہ سے ۷ میل کے فاصلے پر مقام سقیا میں رہتے تھے۔ حضرت عُیینہ نے رات کو پہنچ کر چھاپہ مارا۔ گیارہ مرد، ۲۱ عورتیں اور ۳۰ بچے گرفتار کر کے مدینے لائے گئے۔ آخر بنی تمیم نے دس آدمیوں پر مشتمل ایک وفد حضورؐ نبی اکرم کی خدمت میں روانہ کیا۔ جب یہ لوگ مدینے پہنچے تو حجرۂ نبوی کے پاس کھڑے ہو کر بڑے غیر شائستہ انداز سے اُونچی آواز میں پکارنے لگے "یا محمدؐ! یا محمدؐ! ذرا باہر تو آؤ۔ ہم مفاخرہ اور شاعری میں مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔"

رسولِ برحق شائستگی اور تہذیب کے معلّم و مربّی تھے۔ آپؐ کو اس طرح پکارا جانا خدا کو ناپسند ہوا اور سورۂ حجرات کی آیت نمبر ۴ اور ۵ نازل ہوئیں۔

تاہم حضورؐ حجرے سے باہر تشریف لائے۔ حضرت بلالؓ نے ظہر کی اذان کہی۔ نماز سے فارغ ہو کر حضورؐ صحنِ مسجد میں تشریف فرما ہوئے۔ آنے والوں سے مقصد پوچھا۔ اُنھوں نے کہا کہ ہم مفاخرت کے لیے آئے ہیں۔ مفاخرت عربوں کے کلچر کا جزو تھی۔ یہ ایک طرح کا مقابلہ تھا۔ ایک فریق کا خطیب، اور دوسرے فریق کا خطیب اپنے اپنے آبائی اور نسلی مفاخرہ بیان کرتے۔ وفد والوں نے کہا کہ آپؐ ہمارے خطیب اور شاعر کو موقع دیں۔ وفد بنو تمیم کی طرف سے عُطارد بن حاجب نے خطبہ پڑھا۔ اب حضورؐ کے حکم سے حضرت ثابت بن قیس انصاری اُٹھے اور اُنھوں نے روایتی مفاخرت کے انداز سے ہٹ کر پہلے خدا کی حمد

بیان کی، پھر رسولؐ اور قرآن کا ذکر کیا، پھر مہاجرین اور ان کے بعد انصار کی خوبیوں کو بیان کیا۔ یہ ایک طرح کا دعوتی خطبہ تھا۔

پھر بنو تمیم کا شاعر زبرقان بن بدر کھڑا ہوا اور اپنی قوم کی شان میں قصیدہ پڑھا۔ ادھر سے بحکمِ رسالتِ مآب حضرت حسان نے فی البدیہہ ایک قصیدہ خدا و رسولؐ اور علمبردارانِ دین کی شان میں پڑھا۔

وفد کے ایک اہم رکن اُقرع بن حابس نے کہا، خدا کی قسم رسول اللہ کا خطیب اور شاعر ہمارے خطیب اور شاعر سے زیادہ بہتر ہے۔ پھر سب نے اسلام قبول کیا۔ رسولِ خدا نے ان کے تمام قیدی ان کو واپس کر دیے۔

تقریر ۴۲

حج میں سورۂ براءت کا اعلان

غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد محسنِ انسانیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے چند ماہ مدینے ہی میں مسلسل قیام رکھا۔ اسی زمانے میں جناب صدیق اکبرؓ کو اپنے نائب کی حیثیت سے تین سو صحابہ کے قافلۂ حجاج کا امیر بنا کر مکّے روانہ کیا۔ واضح رہے کہ بموجبِ روایات یہ حج فرضیتِ حج سے پہلے ہوا۔

حضرت صدیق اکبرؓ کی روانگی کے بعد سورۂ براءت کی آیات نازل ہوئیں جن میں نقضِ عہد کے سلسلے میں رہنمائی دی گئی تھی، سورۂ براءت میں جو پیغام مخالفینِ اسلام کے لیے تھا اسے حج کے اجتماع میں پہنچانے کے لیے حضورؐ نے اپنے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے حضرت علیؓ کو روانہ کیا کہ وہ سورۂ براءت کو مخالفین کے سامنے پڑھ کر سنا دیں۔

راستے میں جب حضرت علیؓ قافلۂ حج سے جا کر ملے تو قاعدے کے مطابق حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت علیؓ مرتضیٰ سے پوچھا کہ آپ امیرِ قافلہ کی حیثیت سے بھیجے گئے ہیں یا مامور کی حیثیت سے۔ اُنھوں نے جواب دیا مامور کی حیثیت سے یعنی حج کا سارا پروگرام تو حضرت ابوبکرؓ کی امارت کے تحت رہا۔ حضرت علی مرتضیٰ کی ڈیوٹی صرف اتنی تھی کہ وہ حضورِ پاک

کی طرف سے سورۂ براءت سُنا دیں۔

یہ پہلا موقع تھا کہ عبادتِ حج اصل ابراہیمی سُنت کے مطابق ادا کی گئی۔ قرآن نے حج کے متعلق جو اصلاحات نافذ کیں وہ یہ تھیں :۔

حج سے تعلق رکھنے والے میلے ٹھیلے بند کر دیے گئے۔ اور ان موقعوں پہ شاعری اور مفاخرت کے جو مقابلے ہوتے تھے ان کو ختم کر کے عبادت کا رنگ اُبھار دیا گیا۔

دورانِ حج میں رَفث، فسُوق اور جِدال کی ممانعت کر دی گئی۔ یعنی ازدواجی تعلق پہ پابندی لگ گئی، گالم گلوچ اور دنگا فساد کو ممنوع کر دیا گیا۔

باپ دادوں کی شان بیان کر کے ان پر فخر کرنے کا جو طریقہ جاہلی دور میں حج کے ساتھ رائج ہو گیا تھا، اسے ختم کر کے ذکرِ الٰہی کی ہدایت دی گئی

قربانی کرنے کا حکم دینے کے ساتھ، اس امر کی ممانعت کی گئی کہ قربانی کا گوشت کھبے سے لٹکایا جائے یا دیواروں پر خون ملا جائے۔

مشرکانہ روایت کے مطابق عریاں ہو کر طواف کرنے کی ممانعت کر دی گئی اور بے حیائی سے روکا گیا۔ مثبت طور پر قرآن میں تاکید کی گئی کہ ہر عبادت کے وقت لباس سے آراستہ ہونا چاہیئے۔

"نسی" کے رواج کو یکسر ختم کر دیا گیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ حج کے لیے جن چار مہینوں کو واجب الاحترام قرار دیا گیا تھا، ان میں مشرکانہ نظام کے اکابر جب چاہتے تبدیلی کر لیتے کہ اس مرتبہ فلاں حرام مہینہ فلاں سے بدل دیا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں ہر سال غور و خوض کر کے کیلنڈر سسٹم کو اپنے مفاد کے مطابق بدل لیا جاتا۔ مثلاً کوئی جنگ کرنی ہے، یا تجارت کے لیے نکلنا ہے، تو جیسی ضرورت ہوئی تبدیلی کر لی جاتی۔ کیلنڈر میں گڑبڑ کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔

ان اصلاحات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کوئی بھی تعمیر و اصلاح چاہنے والی حکومت اور خاص طور پر اسلامی حکومت مختلف اداروں اور معاملوں کے خراب پہلوؤں کو جُوں کا توں چلنے نہیں دے سکتی۔ بلکہ وہ عبادات اور رسموں اور رواجوں اور انسانی

رابطوں اور اداروں کی ہیئت اور قدروں کی ترتیب میں جہاں کہیں جاہلیت یا باطل یا فسق و فجور کے اثرات باقی ہے، چیتے کی آنکھ سے وہ ایک ایک ذرۂ فاسد کو نشان زد کر کے اسے نوچ کر الگ کر دیتی ہے۔ خدا کا تو صراحت سے بیان کردہ مقصدِ دین یہ ہے "طیب" سے "خبیث" کو الگ کر دیا جائے۔

خیر، حضرت ابو بکر صدیقؓ جب واپس مدینے پہنچے تو حضورؐ کی زیارت کرتے ہوئے دریافت کیا کہ "یارسول اللہ! کیا میرے خلاف کوئی حکم نازل ہوا" حضورؐ نے فرمایا! "نہیں ہرگز نہیں"، چونکہ مقصدِ سوال نبیٔ اکرم پر واضح تھا۔ اس لیے مزید یہ فرمایا کہ! "یہ مناسب نہ تھا کہ میرے اہل کے سوا کوئی اور شخص معاہدے کے متعلق اعلان کرے"۔ اس وضاحت سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اطمینان ہو گیا۔

حضرت علیؓ نے حضورؐ کے ارشاد کے مطابق سورۂ توبہ کا اعلانِ براءت بھی پڑھ کر سنایا اور حسبِ ذیل چار باتوں کا بھی اعلان کیا:

۱۔ جنّت میں کوئی ایسا شخص داخل نہ ہوگا جو دینِ اسلام کو قبول کرنے سے انکار کرے۔

۲۔ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لیے نہ آئے۔

۳۔ بیت اللہ کے گرد برہنہ طواف کرنا ممنوع ہے۔

۴۔ جن لوگوں کے ساتھ رسول اللہؐ کا معاہدہ باقی ہے، یعنی جو نقضِ عہد کے مرتکب نہیں ہوئے اُن کے ساتھ مدّتِ معاہدہ تک وفا کی جائے گی۔

اصل سورہ میں بہ حیثیت مجموعی مشرکین کے وجود کو ایک طرح سے خلافِ قانون (OUT LAW) قرار دے دیا گیا اور ان کو چار مہینے کی مدّت دی گئی کہ وہ سوچ لیں کہ آیا ان کو حضورؐ کے خلاف لڑنا ہے، ملک چھوڑ دینا ہے یا اسلام لا کر امن و سلامتی کی زندگی گزارنی ہے۔

تقریر ۳۳

مدینے میں وفود کی آمد

اللہ کی شان ہے کہ ایک وقت تھا، جب محسن انسانیت جناب محمد مصطفیٰؐ ایک ایک آدمی کو تلاش کر کے دعوت پہنچانے کی کوشش کرتے اور اس کوشش میں بھی مزاحمتیں پیش آتیں۔ اب دوسرا مرحلہ یہ سامنے آیا کہ عرب کے مختلف علاقوں سے وفود کی آمد کا تانتا بندھ گیا جو خود مدینے حاضر ہو کر اسلام کی تحریکِ فلاحِ انسانیت میں شریک ہوتے۔

تاریخ کی بے شمار مثالیں گواہ ہیں کہ ہر دینی دعوت یا تحریک یا جماعت جب نمودار ہوتی ہے تو اگر وہ انقلابی روح رکھتی ہو، یعنی انسانی کردار اور معاشرے کے اجتماعی نظم کا جو ڈھانچہ پہلے سے موجود ہو، اسے توڑنا یا بدلنا چاہے تو اسے پہلے کی قائم شدہ قیادت اور اہلِ مفاد کے صفوں کی طرف سے سخت کش مکش پیش آتی ہے۔ یہ کش مکش دراصل دو اقلیتی مگر فعال عناصر کے درمیان ہوتی ہے۔ اگر پہلے سے قائم شدہ قوت نئی اُٹھنے والی دعوت کو کچل دے تو عوام وہیں رہتے ہیں جہاں تھے، لیکن اگر نئی قوت مسلسل زور پکڑتی چلی جائے تو آہستہ آہستہ جمود پسند عوام بھی اپنا وزن اُدھر ڈالتے چلے جاتے ہیں۔ خاص طور پر جب ایسا مرحلہ آجائے کہ یہ حقیقت محسوس ہونے لگے کہ اب پرانی قیادت ختم ہو رہی ہے اور مستقبل نئی

قوّت کا ہے تو پھر لوگ تیزی سے نئے مرکز قوت کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔

یہی صورت عرب میں پیش آئی۔ قریشِ مکّہ اور ان کے حامیوں نے محمّدی تحریک کے خلاف جنگ و تصادم کا جو سلسلہ شروع کر رکھا تھا، اس میں وہ مسلسل پسپا اور مغلوب ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ فتح مکّہ کے بعد ان کی بالکل کمر ٹوٹ گئی۔ اس حالت کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے لوگ چاروں طرف حضورؐ کے ہاتھ پر اسلام اور اطاعت کی بیعت کرنے کے لیے اُمڈ پڑے۔ وفد پہ وفد آنے لگے۔ اسی لیے سنہ ہجری کا نام ہی سالِ وفود ہے۔ ویسے سلسلۂ وفود ۹ ھ ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ دو تین وفود کا ذکر پہلے ہو چکا۔ اب چند اہم وفود کا اجمالی بیان ہو جائے۔ عام الوفود کا ذکر بھی اسی عنوان میں شامل ہے۔ یہاں تمام وفود کا تذکرہ کرنا ممکن نہیں۔

یک نفری وفد ثقیف

فتح مکّہ و حنین کے بعد جب حضورؐ واپس مدینے آ رہے تھے تو عُروہ بن مسعود ثقفی راستے ہی میں آ کر رسولؐ پاک کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ نام معاہدۂ حدیبیہ کے سلسلے میں سامنے آ چکا ہے۔ عُروہ نے حضورؐ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کی اور اپنی قوم میں تبلیغ کی اجازت چاہی۔ حضورؐ نے اندیشہ ظاہر کیا کہ تمہاری درشت مزاج قوم تم کو کہیں قتل نہ کر دے۔ وہی ہوا انھوں نے جا کر گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر سب کو اسلام کی دعوت دی۔ لوگوں نے ان پر تیر چلائے۔ وہ شہید ہو گئے۔

پھر لوگ ایک ماہ تک اس سوچ میں پڑے رہے کہ کیا کریں۔ آخر ایک سردار عبدیالیل ۵ رکنی وفد لے کر مدینے روانہ ہوا۔ حضورؐ سے ملاقات کے وقت وفد نے تین عجیب شرائط پیش کیں۔ پہلی یہ کہ نماز ہمیں معاف کر دی جائے۔ دوسری یہ کہ ہمارے بُت لات کو ۳ سال تک منہدم نہ کیا جائے۔ تیسری یہ کہ ہمارے بُت ہمارے ہاتھوں سے نہ تڑوائے جائیں۔

حضورؐ نے پہلی دو شرائط کو تو قبول کرنے سے انکار کر دیا، البتہ تیسری کے متعلق فرمایا کہ "یہ ہو سکتا ہے۔" پھر سب نے اسلام قبول کیا اور واپس ہوئے۔

بعد میں حضورؐ نے صحابیوں کی ایک جماعت کو بھیج کر ان کے ذریعے لات نامی بُت

کو منہدم کرایا۔

وفد بنی حنیفہ

یمامہ سے بنو حنیفہ کے افراد ثمامہ بن اثال کی دعوت سے متاثر ہو کر آئے اور اسلام لائے۔ مسیلمہ کذاب بھی ساتھ تھا۔ اس نے حضورؐ کے اقتدار میں سے حصّہ بٹانا چاہا۔ وہ کج ذہن دین کو بھی محض ایک دکانداری سمجھ کر کہنے لگا کہ اگر حضورؐ اپنے بعد مجھے قائم مقام مقرر کرنے کا فیصلہ کریں تو میں بیعت کروں۔ حضورؐ کے ہاتھ میں کھجور کی ایک شاخ چھڑی کے طور پر تھی۔ اس کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ تم اگر یہ بھی مانگو تو میں تمھیں نہیں دے سکتا۔ ساتھ ہی فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جو کچھ تیرے لیے مقدر فرما دیا ہے۔ اس میں سرمو فرق نہیں آسکتا۔ اور غالباً تو وہی ہے جسے مجھے خواب میں دکھلایا گیا ہے۔ حضورؐ کو خواب میں دو کذّابوں کے بارے میں اشارہ دیا گیا تھا۔

بعد میں مسیلمہ کذّاب نے حضورؐ کو خط لکھا جس کا اصل مضمون یہ تھا کہ "میں تمھارے ساتھ شریک مقرر کیا گیا ہوں۔ نصف زمین ہمارے لیے، نصف قریش کے لیے۔"

حضورؐ نے جواباً لکھوایا کہ "زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں جسے چاہے عطا کرے۔"

وفد بنی عامر

ایک وفد بنی عامر بن صعصعہ کی طرف سے حاضر ہوا۔ باتوں باتوں میں وفد کے ایک رکن عامر بن طفیل نے مدینے پر حملہ کرنے کی دھمکی دی۔ حضورؐ نے فرمایا: "اللہ تجھ کو اس کی قدرت نہیں دے گا۔" اس شقی آدمی نے اپنے ایک ساتھی کو اُکسایا کہ کسی ملاقات کے دوران میں حضورؐ کو قتل کر دے۔ وہ کہتا ہے کہ دو ایک بار میں نے ارادہ بد کیا تو ایک دفعہ آہنی دیوار حائل نظر آئی اور دوسری دفعہ اونٹ جو منہ پھاڑے میرے سر کو پکڑنا چاہتا ہے۔ جب یہ لوگ اُٹھے تو حضورؐ نے دُعا فرمائی: "اے اللہ! مجھے عامر بن طفیل کے شر سے محفوظ رکھ۔"

وفد واپس چلا گیا۔ راستے ہی میں عامر بن طفیل طاعون کا شکار ہو گیا، دوسرے ساتھی

اربد بن قیس پر بجلی گری۔ بقیہ اراکین وفد نے خلوصِ دل سے اسلام قبول کیا۔

وفد فزارہ

بنی فزارہ کے ۱۴ آدمیوں کا وفد حاضر ہو کر اسلام لایا۔ حضورؐ نے علاقے کا حال پوچھا تو وفد والوں نے عرض کیا کہ قحط کی وجہ سے تباہ حال ہیں۔ حضورؐ نے بارانِ رحمت کی دُعا فرمائی۔

وفد عبدالقیس

قبیلۂ عبدالقیس کے ۱۴ افراد کا ایک وفد ۵ ھجری میں مدینے آیا تھا۔ ۸ یا ۹ ھجری میں دوسری بار ۴۰ افراد کا بڑا وفد آیا۔ حضورؐ نے ان لوگوں کا خیر مقدم ان الفاظ سے کیا: "مرحبا ہے اُس قوم کو جو نہ ذلیل ہوئی، نہ شرمسار!" یہ لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے اور انھوں نے عرض کیا کہ ہمارے راستے میں چونکہ قبیلہ مُضر کے مشرکین حائل ہیں اس لیے حرام مہینوں کے علاوہ ہم حاضر نہیں ہو سکتے۔ ہمیں کوئی جامع نصیحت فرمایئے۔ حضورؐ نے فرمایا:

"خدائے واحد پر ایمان لاؤ۔ گواہی دو کہ اللہ ایک ہے؛ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) اللہ کے رسول ہیں۔ نماز قائم کرو۔ زکواۃ ادا کرو، مالِ غنیمت میں سے پانچواں حصہ بیت المال کے سپرد کرو۔"

پھر فرمایا، کہ جو لوگ تمھارے پیچھے رہ گئے ہیں، ان کو بھی انھی باتوں کی دعوت دو۔

وفد بنی مرّہ

بنی مُرّہ کے ۱۲ افراد کا وفد حاضر ہوا اسلام قبول کیا۔ قحط سالی کی تباہ کاریوں کا ذکر کیا۔ حضورؐ نے بارش کی دُعا فرمائی۔ یہ لوگ واپس گئے تو معلوم ہوا کہ عین اسی روز بارش ہوئی جس روز حضورؐ نے دُعا کی تھی اور تمام علاقہ سرسبز و شاداب ہو گیا۔

حضورؐ نے وفد کے ارکان کو سفر خرچ کے طور پر دس دس اُوقیہ چاندی دی اور ان

کے سردار کو ۱۲ اوقیہ۔
اب ہر طرف سے لوگ آکر خود اسلام قبول کرنے لگے۔

وفد قبیلۂ طے

قبیلۂ طے کے ۱۵ آدمی حاضر خدمت ہوئے۔ ان کا سردار زید الخیل تھا جس کے اسلام لانے پر حضورؐ نے اس کا نام زید الخیر رکھا اور اس کی خوبیوں کی تعریف کی۔

وفد ہمدان

قبیلۂ ہمدان کے ۱۲۰ آدمیوں کا بڑا وفد حاضر ہوا۔ بہت خوش پوش تھے۔ اُنھوں نے بڑی وضاحت کے ساتھ حضورؐ سے گفتگو کی۔ ان کی ہر درخواست کو حضورؐ نے منظور کیا۔ ایک تحریر ان کو لکھوا دی۔ نیز ان میں سے مالک ابن نمط کو یمن کے مسلمانوں کے لیے امیر مقرر کیا۔

واضح رہے کہ ایک سال پہلے رسولِ برحق نے حضرت خالد بن ولید کو ان لوگوں کی طرف دعوتِ اسلام دینے کے لیے بھیجا۔ چھ ماہ اُنھوں نے کام کیا مگر کوئی شخص مسلمان نہ ہوا۔ پھر حضرت علی مرتضیٰ کو بھیجا گیا۔ انھوں نے لوگوں کو جمع کر کے حضورؐ کا خط پڑھ کر سنایا اور اسلام کی دعوت دی۔ ایک ہی دن میں سب لوگ مسلمان ہو گئے۔ جب یہ اطلاع حضورؐ کو ملی تو سجدے میں سر رکھ کر شکر ادا کیا۔

قبیلہ بنی اسد کے دس آدمی آئے۔ اسلام قبول کیا اور حضورؐ سے کہا کہ ہم آپ کے بلائے بغیر ہی آگئے ہیں۔ اس پر سورۂ حجرات کی وہ آیت اُتری جس میں کہا گیا ہے کہ لَا تَمُنُّوا عَلَیَّ اِسلَامَکُم (اپنے مسلمان ہونے کا احسان مجھ پر نہ رکھو)
کہانت اور رمل پر اُنھوں نے سوال کیا۔ حضورؐ نے ممانعت فرمائی۔

وفد بنی عبس

بنی عبس کے ۳ آدمی آئے۔ حضورؐ سے عرض کیا کہ اسلام ہجرت کے بغیر معتبر نہیں۔ اگر

یہ صحیح ہے تو ہم اپنے مال مویشی فروخت کر کے حضورؐ کے پاس آ جائیں۔ فتح مکّہ کے بعد ہجرت کی فرضیت ختم ہو گئی تھی۔ حضورؐ نے ان کو جواب دیا کہ جہاں بھی رہو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، وہ تمھارے نتائج اعمال میں کوئی کمی نہ کرے گا۔

بنی مُنتفِق کا ایک وفد عین اس وقت پہنچا جب حضورؐ اخروی زندگی کے متعلّق خطبہ دے رہے تھے۔ خطبہ سُننے کے بعد یہ لوگ اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے۔ قبیلۂ اُزد کے سات افراد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ نے ان کی وضع قطع اور گفتار و کردار کو بہت پسند کیا۔

یہ لوگ پہلے سے ایمان لا چکے تھے۔ حضورؐ نے ان سے ایمان واخلاق کے متعلّق چند سوال کیے۔ اُنھوں نے درست جواب دیے کیونکہ معلّمینِ اسلام سے وہ سیکھ چکے تھے۔ حضورؐ نے چند مزید باتوں کی نصیحت کی۔

وفد نصارائے نجران

نجران مکّے سے سات منزل دور یمن کا ایک بہت بڑا شہر تھا جس کے ساتھ ۷۳ گاؤں بھی ملحق اور تابع تھے۔

عبدالمسیح عاقب کی قیادت میں نجران کے ۶۰ نصاریٰ وفد میں شامل تھے، بقیہ ۱۴ شہر کے اشراف و اعیان تھے۔

وفد کی آمد سے قبل عصر کی نماز پڑھی جا چکی تھی۔ وفد کے لوگوں نے بھی اپنے وقت پر نماز پڑھنا چاہی۔ بعض صحابہ کو یہ بات ناپسند ہوئی۔ مگر حضورؐ نے فرمایا کہ انھیں پڑھنے دو۔ اُنھوں نے مشرق کی طرف مُنہ کر کے اپنے طریق پر نماز پڑھی۔

وفد کا اہم ترین موضوع بحث حضرت عیسیٰ اور ان کے متعلّق نصرانی عقیدہ تھا۔ اس پر طویل گفتگو ہوئی اور حضورؐ نے الوہیت عیسیٰ کی تردید میں پُر زور دلائل دیے۔ وہ لوگ حق کو پہچان کر بھی قبول حق پر تیار نہ تھے۔ اس مرحلے پر آل عمران کی آیات ۱ تا ۶ ۱۰ اور ۵۹ تا ۶۱ نازل ہوئیں۔ ان آیات میں مباہلہ کا چیلنج تھا یعنی جب دلائل و شواہد سے فیصلہ نہ ہوتا ہو تو دونوں فریق

اپنی اپنی آل اولاد کو لے کر میدان میں آجائیں اور دونوں یہ دُعا کریں کہ جو فریق باطل پر ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔ چیلنج کے مطابق حضورؐ اپنی صاحبزادیؓ اور نواسوں اور حضرت علیؓ کو لے کر میدان میں آ گئے۔ نصاریٰ پر مرعوبیت طاری ہو گئی۔ حضورؐ سے مہلت مانگی کہ مشورہ کر لیں۔ آپس میں بات کرتے ہوئے وہ یہاں تک کہتے رہے کہ "خدا کی قسم! یہ اللہ کے رسول ہیں۔ اس لیے ہم کو مباہلہ سے گریز کرنا چاہیئے۔"

حضورؐ نے فرمایا کہ عذاب اہلِ نجران کے سروں پر آ گیا تھا۔ اگر لوگ مباہلہ کرتے تو بندر اور خنزیر بنا دیے جاتے، اور تمام وادی میں ان پر آگ برستی۔

دوسرے روز ایک معاہدہ طے پایا جس کے رُو سے اہلِ نجران کی حفاظت کی ذمہ داری مسلم حکومت پر ڈالی گئی اور اس کے جواب میں ذمہ ٹیکس اہل نجران پر عائد ہوا۔ معاہدہ خاصا طویل ہے۔

جب یہ لوگ واپس نجران میں پہنچے تو وہاں پھر ان میں بحث چھڑ گئی کہ یہ نبی اگر سچا موعود نبی ہے تو ہمیں اس پر ایمان لانا چاہیے تھا۔ ایک عیسائی سردار سب سے الگ بھاگ کر مدینے پہنچا اور تحریکِ اسلامی کا علمبردار بن گیا۔ بعد میں دو اور سردار بھی آ گئے اور وہ بھی اسلام کے نور سے بہرہ مند ہوئے۔

اصل میں نجران کی آبادی کے ۲ حصے تھے۔ ایک غیر عیسائی امیّین کا، دوسرا نصاریٰ کا۔ پہلے گروہ نے شروع ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ دوسرے نے جزیہ پر صُلح کی۔[1]

---

[1] نجران کے نصرانیوں کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے اب دوسرے غیر عیسائی عُنصر کا قصّہ سُنیے۔ رسولِ خداؐ نے حضرت خالد بن ولید کو بنی حارث کی طرف بھیجا کہ تین روز تک دعوتِ اسلام دیں۔ پھر اگر وہ نہ مانیں تو مقابلہ کریں۔ ہوا یہ کہ بنی حارث نے حضرت خالد کے جاتے ہی اسلام قبول کر لیا۔ پھر حضرت خالد بن ولید نے آس پاس کی آبادیوں میں دعوت پہنچائی۔ ہر طرف کے لوگ بلا تامل اسلام کو قبول کرتے گئے۔

حضورؐ نے قیس بن حصین کو امیر مقرر کیا۔ وفد کے جانے کے بعد عمرو بن حزم کو

وفد قبیلۂ اُزد

قبیلۂ اُزد کے ۱۵ آدمی حاضر ہوئے اور مسلمان ہوئے۔ حضورؐ نے حضرت صرد بن عبداللہ کو ان پر امیر مقرر فرما کر علاقے میں جہاد کرنے کی اجازت دی۔ یعنی یہ چھوٹی موٹی مخالف قوتوں کا دبانے کی ذمہ داری تھی۔ انھوں نے اہلِ جُرش کا محاصرہ کر لیا۔ بعض مراحل سے گزرنے کے بعد فتح پائی۔

وفد خولان

یمن ہی سے قبیلۂ خَولان کے دس آدمیوں کا وفد آیا۔ ان لوگوں نے بیان کیا کہ "ہم پہلے سے ایمان لا چکے ہیں، محض حضورؐ کی زیارت کے لیے حاضر ہوئے ہیں" حضورؐ نے فرمایا، ہر قدم پر تمھارے لیے نیکی ہے۔ جو شخص میری زیارت کے لیے مدینے حاضر ہوا وہ قیامت کے دن میری پناہ اور امان میں ہوگا۔"

حضورؐ نے ان لوگوں کو ضروری تعلیمات دیں، نصائح کیں اور ۱۲-۱ اوقیہ چاندی زادِ راہ کے طور پر عنایت فرمائی۔

وفد غسان

غسان کے تیس آدمی بارگاہِ رسالت میں آئے اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضورؐ نے ان کو بھی زادِ سفر دیا۔

(بقیہ حاشیہ از ص ۱۹۹)

تعلیمِ دین اور وصولیٔ صدقات کے لیے مامور فرمایا اور ایک مفصل تحریر ان کو لکھ کر دی۔ یہ تحریر کتابوں میں محفوظ ہے۔ اس میں زکوٰۃ و صدقات کے احکام بھی بیان کیے گئے ہیں، جزیے کے بھی، زمینوں کے حقوق کا بھی تذکرہ ہے اور مسلمان حاکم کی ذمہ داریوں کا بیان بھی۔

یمن

یمن کی طرف رسولِ خدا نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو تین سو آدمیوں کے ساتھ روانہ فرمایا کہ وہاں جاکر پہلے دعوتِ اسلام دینا۔ اگر وہ لوگ اسلام لے آئیں تو کوئی تعرض نہ کرنا۔ "خدا کی قسم! اگر تیری تبلیغ سے ایک شخص بھی ہدایت پا جائے تو دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔"

حضرت علی نے علاقے میں جاکر کام کیا۔ مگر کسی نے اسلام قبول نہ کیا۔ مجبوراً جنگ کی جس کے نتیجے میں مالِ غنیمت بھی ہاتھ آیا۔

وفد قبیلہ سلامان

ماہِ شوال میں قبیلہ سلامان کا ایک وفد پہنچا جو سات افراد پر مشتمل تھا۔ انھوں نے اسلام قبول کیا۔ بعد میں اپنے علاقے کی قحط سالی کا حال سنایا۔ حضورؐ نے بارانِ رحمت کی دعا کی۔ ان کو بھی زادِ راہ دے کر رخصت کیا۔

وفد قبیلہ تجیب

یمن کے قبیلہ کندہ کی ایک شاخ قبیلہ تجیب تھی۔ اس قبیلے کے ۱۳ آدمی صدقات کا مال لے کر بارگاہِ رسالت میں پہنچے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اس مال کو وہیں لے جاؤ اور وہیں کے فقرا پر تقسیم کر دو۔ وفد نے بتایا کہ ہم فقرا کو دینے کے بعد بچا ہوا مال لائے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق شریکِ محفل تھے۔ کہنے لگے "یا رسول اللہ تجیب جیسا وفد آج تک نہیں آیا۔"

ان لوگوں نے حضورؐ سے بہت سے مسائل دریافت کیے جن کے جوابات لکھوا کر دیے گئے۔ رسولِ پاکؐ نے جناب بلالؓ سے فرمایا کہ ان مہمانوں کی تواضع اچھی طرح کی جائے۔ چند روز رہ کر وفد کے لوگوں نے اجازت چاہی اور عرض کیا کہ ہم نے جو فیوض و برکات حاصل کیے ہیں، ان کو اپنی قوم تک پہنچانا چاہتے ہیں۔

حضورؐ نے ان کو کافی زادِ راہ دیا۔

جاتے جاتے اہلِ وفد نے کہا کہ ایک نوجوان حاضری سے رہ گیا ہے جو سامان کی حفاظت پر مامور تھا۔ اسے بلوایا گیا۔ اس نے حضورؐ سے درخواست کی کہ یا رسولؐ اللہ! آپؐ نے میرے قبیلے کی حاجات پوری فرمائیں، میری بھی ایک حاجت ہے۔ دریافت کرنے پر اس نے کہا کہ میں صرف اس لیے گھر سے نکلا ہوں کہ حضورؐ میرے لیے خدا سے مغفرت کی دُعا فرمائیں۔ وہ مجھ پر رحم فرمائے اور میرے دل کو غنی کر دے۔ یہی دُعا حضورؐ نے کی۔

بعد میں یہ نوجوان زہد و قناعت کا مجسمہ ثابت ہوا، اور حضورؐ کے وصال کے بعد جب فتنہ ارتداد کا سلسلہ چلا اور یمن والوں میں بھی تزلزل پیدا ہوا تو اسی نوجوان کے وعظ و تلقین سے اہلِ یمن ایمان پر قائم رہے۔ ∞

تقریر ۳۴

کاذب مدعیانِ نبوت کا فتنہ

محسنِ انسانیت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کا انتہائی درخشاں اور تکمیلی باب اب ہمارے سامنے آ رہا ہے۔

لیکن اس پر بات کرنے سے پہلے ایک تخریبی فتنے کا ذکر جس نے کئی اطراف سے سر اُٹھایا، مگر بہت جلد اس کا قلع قمع ہو گیا۔ شیاطینِ جن وانس نے اپنی ساری ذہانتیں جمع کر کے حضورؐ کی تحریک اور ریاست کے خلاف یہ چال چلی کہ جعلی نبوتوں کے جھنڈے بلند کرا دیے۔ حضورؐ کی تیار کردہ قیادت نے حالات کی پیچیدگی کے باوجود بڑے مضبوط ہاتھوں سے ان فتنوں کا سر کچلا، اور ارتداد کے اثر سے نکال کر عوام کو اسلام کے نظم میں کس دیا۔

مسیلمہ کذاب کا تذکرہ وفود کے سلسلے میں آ چکا ہے۔ یہ شخص ادب و شعر سے مس رکھتا تھا، اس لیے قرآن کی آیات کو سامنے رکھ کر مقفیٰ عبارتیں گھڑ لیتا اور اپنے صحرائی عوام کو سناتا۔ اس کا دعویٰ و مطالبہ یہ تھا کہ آدھا علاقہ محمدؐ لے لیں اور اس میں ان کی نبوت چلے، آدھا علاقہ میرے پاس رہے اور اس میں میں نبوت کروں۔ جن لوگوں کی ذہنی وابستگی ابھی جاہلیت سے باقی تھی یا جن میں شراب اور زنا اور قمار کی مخفی دلچسپیاں موجود تھیں،

وہ لوگ اس کے ساتھ ہو لیے۔ کچھ نو مسلم جو ابھی تعلیم و تربیت نہیں پا چکے تھے، اُن کو اس شخص نے رام کر لیا۔ اور ایک طرح کی تحریک ارتداد اٹھا دی۔ دورِ صدیقی میں اس کا خاتمہ ہوا۔

پھر ایک عورت مسیلمہ کے علاقے کے پڑوس میں اُٹھی جس کا نام سجاح تھا۔ اس نے مساواتِ مرد و زن کے فلسفے سے سرشار ہو کر زنانہ نبوت کا علم پوری تاریخ میں پہلی بار بلند کیا۔ مسیلمہ نے اس سے ملاقات کی۔ تنہائی میں گفتگو ہوئی۔ مسیلمہ نے شیطانی وحی کے ایسے پارے پیش کیے کہ سجاح جنس کی رَو میں بہہ گئی اور وہ مع اپنے دعوائے نبوت کے مُسیلمہ کی شخصیت میں ضم ہو گئی۔

اسی طرح یمن سے ایک شخص ذرا بعد میں مدعئ نبوت بن کر اُٹھا۔ یہ اَسود عنسی تھا۔ اس کے اثر و نفوذ کا باعث اس کے جادُو منتر وغیرہ کے مشغلے تھے۔ اس ظالم نے اسلامی حکومت کے بعض افسروں اور معلموں کو قتل کرا دیا اور بعض کو اپنے علاقے سے نکال دیا۔ اس نے ایک ایرانی النسل مسلمان کو قتل کر کے اس کی خوب رُو بیوی کو جبراً رونق خانہ بنا لیا۔ یہ خاتون ایمان میں اتنی پختہ تھی کہ اسی کی امداد سے اسلامی حکومت اسودِ عنسی پر قابو پا سکی۔

طُلیحہ بن خُویلد اسدی کو بھی یہ نمونہ دیکھ کر شوق چرّایا اور اپنے قبیلے بنو غطفان سے اسے کچھ پیرکار مل گئے۔ اس کا خاتمہ بھی دورِ صدیقی میں ہوا۔

عمّان کے لقیط بن مالک ازدی کے دماغ میں جھوٹی نبوت کا کیڑا کلبلانے لگا۔

یہ تمام متفنّی افراد جب زکوٰۃ کے اموال کا ایک سیلاب مدینے کی طرف جاتا دیکھتے تو ان کے مُنہ میں پانی بھر آتا۔ مگر انھیں صرف یہ بات سمجھ میں نہ آسکی کہ نبوت صرف دعوے کے پٹھے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ذہن و کردار کی دھات بھی پاکیزہ ہونی چاہیے۔ کسی کھوٹی دھات کے اُوپر اشرفی کا ٹھپہ لگانے سے اشرفی نہیں بنتی۔ یہ بچارے نبوت کی جو اشرفیاں لے کے آئے وہ تاریخ کے بازار میں ٹھیکریاں نکلیں۔

تقریر ۳۵

حجۃ الوداع

اب ہمارے سامنے حجۃ الوداع کا عظیم الشان واقعہ ہے۔

حج اسلام کی پانچ بنیادی فرض عبادتوں میں سے ایک ہے۔ ہر مسلمان کے لیے بشرطِ استطاعت عمر بھر میں ایک مرتبہ بیت اللہ شریف تک جانا اور ارکانِ حج ادا کرنا ضروری ہے۔ کعبہ اور اس کے اردگرد کی مسجد، اور اس کے پاس پھیلے ہوئے حرم میں بڑی برکات ہیں۔ اس مقدس فضا میں حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی قربانیوں کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ ان کی دعاؤں کی چمک دمک محسوس ہوتی ہے۔ یہاں صفا و مروہ کے ٹیلے ہیں جن کے درمیان حضرت ہاجرہ پیاس سے بلکتے بچے کے لیے ادھر سے اُدھر دوڑتی رہی تھیں۔ یہاں چاہ زمزم ہے جس سے نہ صرف حضرت اسمٰعیل اور ان کی والدہ سیراب ہوئے بلکہ آج تک لاکھوں انسان اس سے اپنی پیاس بجھاتے چلے آرہے ہیں۔ پھر اس ماحول میں پیغمبر آخرالزماں کی دعوت کی گونج سنائی دیتی ہے، اس میں اوّلین علمبردارانِ اسلام کی عقوبتوں کے نقوش گلی گلی پھیلے ہوئے ہیں۔ مزید یہ کہ جیسے مکّہ کو فتح کرنے والی فوج کے دستے مارچ کرتے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ جبلِ نور جس کی چوٹی سارے پہاڑوں سے رنگ اور وضع میں بالکل الگ

ہے، اس پر دہ غار حرا جوں کا توں موجود ہے۔ جس میں حضورؐ پر اوّلیں وحی نازل ہوئی تھی۔ کوہِ صفا ہے جہاں سے آپؐ نے پہلی بار قوم کو پکارا۔ یہیں امِ ہانی کا مکان تھا جہاں سے حضورؐ کا سفرِ معراج شروع ہوا۔ یہیں شعب ابی طالب کا مقام واقع تھا۔ جہاں حضورؐ اور قبیلۂ ہاشم کو ۳ سال تک بند رہنا پڑا۔ پاس ہی غارِ ثور ہے جو سفرِ ہجرت کی منزلِ اوّل بنا۔ یہاں تنعیم ہے جہاں حضرت زید اور حضرت خبابؓ کو مشرکین مکہ نے موت کے گھاٹ اتارا۔

یہاں وہ وادئ محسر ہے جہاں پیغمبر برحق کی ولادت سے ۳ سال قبل اصحابِ فیل پر عذاب وارد ہوا۔ یہاں وہ قربان گاہ ہے جہاں ایک اشارہ الٰہی کے تحت حضرت ابراہیم اپنے بیٹے اسمٰعیل کو ذبح کرنے کے لیے لے گئے تھے۔

غرض کہ یہاں کا ہر ذرہ ہماری تاریخ کے مقدس ترین ابواب کا ایک سنہرا ورق ہے۔ حج سے مقصود جہاں خدا سے کامل وابستگی اور ابراہیمی مرکز توحید سے روحانی تعلق کی استواری ہے، وہاں ایک غرض یہ بھی ہے کہ ہمارا حال ہمارے دین کے شاندار ماضی سے معانقہ کرے۔

جیسا کہ ذکر کر چکے ہیں کہ ۹ ھ کے حج میں اعلانِ براءت کیا گیا۔ حضرت علیؓ نے حضورؐ کے ذاتی نمائندہ کی حیثیت سے سورۂ براءت کی ابتدائی چالیس آیات پڑھ کر سنائیں۔ ان میں مرکزی اعلان یہ تھا کہ مشرکین جو امن کے معاہدوں میں خلل انداز ہوا کرتے رہتے ہیں، ان کے ساتھ معاہدانہ تعلق ختم کیا جاتا ہے اور ان کو چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے کہ چاہیں تو اسلام قبول کریں، چاہیں تو وہ عرب کی اسلامی حکومت کی شہریت ترک کر کے باہر چلے جائیں اور چاہیں تو جنگ کریں۔ اس مہلت کے بعد وہ جہاں بھی نظر آئیں گے قتل کر دیے جائیں گے۔

اس حج میں حضورؐ شرکت نہ فرما سکے تھے، اور اس کے فوراً بعد حج کو اللہ تعالیٰ نے فرض کر دیا۔

۱۰ھ میں حضورؐ نے حج کا ارادہ فرمایا۔ اس کی خبر پھیلی تو آس پاس کے علاقوں

کے لوگ، تیاری کرنے لگے۔

رسولِ برحق نے مدینہ منورہ سے سفرِ حج پر نکلنے سے پہلے ایک خصوصی خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس تقریر میں آپ نے صحابہ کو احرام کے قواعد اور حج کے واجبات وسنن کی تعلیم دی۔ اقدام سے پہلے نمازِ ظہر مسجد میں ادا فرمائی، سر میں تیل ڈالا، کنگھی کی اور عصر سے کچھ پہلے روانہ ہوئے۔ ذوالحلیفہ کے مقام پر احرام باندھنے کے لیے پڑاؤ کیا۔ اور عصر کی نماز قصر کرکے پڑھی۔ اُس دن سے مدینے والوں کے لیے یہی مقام میقات قرار پایا۔ دوسرے دن نمازِ ظہر سے فارغ ہو کر عمرہ اور حج کی نیت کرکے احرام باندھا اور قافلۂ رفقاء کو روانگی کا حکم دیا۔ تلبیہ یعنی لبیك اللھم لبیك کہنے کے بعد حضورؐ اپنی اونٹنی قصویٰ پر سوار ہوئے۔ وقفے وقفے سے حضورؐ خود بھی تلبیہ باآوازِ بلند پڑھتے اور صحابہ کو بھی اس کا حکم دیتے۔ عجیب سماں ہوگا کہ اس مبارک اجتماعی نغمے سے پہاڑیاں اور وادیاں اور گھاٹیاں گونج رہی ہوں گی۔ راستے میں مختلف قبائل کے لوگ آآ کر اس کاروانِ نور میں شامل ہوتے چلے جارہے تھے جیسے چھوٹی چھوٹی ندیاں کسی بڑے دریا میں ملتی جاتی ہیں۔ یہ ایک لاکھ ۲۴ ہزار انسانوں کا متحرک اجتماع گویا حضورؐ کے سامنے اُس ایمانی واخلاقی فصل کے ایک بڑے حصے کو نمایاں کررہا تھا جسے آپؐ نے مصیبتیں اُٹھا اُٹھا کر انسانی قلوب میں بویا تھا، جسے آنسوؤں اور خون کے قطروں سے سینچا تھا، اور جسے تباہ کرنے والے جنگلی جانوروں اور کیڑے مکوڑوں سے اور لو کے تھپیڑوں اور بجلی کے کڑکوں سے بچانے کے لیے آپؐ کے رفقا نے اپنی جانیں قربان کردیں۔ خود قرآن نے حضورؐ کی دعوتِ حق اور اسے قبول کرنے والوں کے لیے یہی تشبیہ استعمال کی ہے۔ کزرعٍ اخرج شطأہٗ!

سفر کے نویں دن یعنی ۴ ذی الحجہ کو صبح کے وقت حضورؐ مکے کے پاس وادی طویٰ میں ذرا دیر کے لیے رُکے پھر مکے میں داخل ہوئے۔ بنو ہاشم کے لڑکوں اور بچوں کو خبر ہوئی تو خوشی کے مارے دوڑے دوڑے آئے۔ حضورؐ نے ان میں سے کسی کو سواری پر اپنے آگے بٹھالیا اور کسی کو پیچھے۔ رسولِ برحق کی پہلی نظر کعبۃ اللہ پر پڑی تو دُعا کی: "اے خدا اِس گھر کو اور زیادہ عزت وشرف دے۔"

پھر کعبہ کا طواف کیا، مقام ابراہیم پر دوگانہ پڑھا۔ پھر حجرِ اسود کی طرف گئے اور اسے بوسہ دیا۔ پھر کوہِ صفا کی طرف پہنچے۔ ہر مقام پر کچھ آیات پڑھیں اور دعائیں کیں۔ پھر سعی کی تکمیل کے بعد مروہ کی بلندی پر کھڑے ہوئے اور ہجوم سے چند مسائلِ حج و عمرہ پر بات کی۔ یوم ترویہ یعنی ۸، ذی الحجہ کو منیٰ کا قصد فرمایا۔ رات وہیں قیام رہا۔ اگلے دن سورج بلند ہونے پر وادیٔ نمرہ میں خیمہ نصب کرایا جس کے ایک طرف عرفات اور دوسری جانب مُزدلِفہ ہے۔ یہ قریش کے رواجوں سے مختلف صورت تھی۔ حضورؐ دن ڈھلنے تک خیمے میں رہے پھر قصویٰ پر سوار ہو کر عرفات تشریف لائے۔ عرفات نامی چھوٹی سی پہاڑی یا ٹیلے پر تشریف لے گئے اور قصویٰ پر سواری کی حالت ہی میں خطبہ دیا۔ اس زمانے کے لوگوں نے بڑے مجمعوں میں آواز پہنچانے کا جو طریقہ نکالا تھا۔ اس کے مطابق آپؐ کے چاروں طرف مکبّر حضرات کھڑے تھے۔ جو آپؐ کے ہر جملے کو بآوازِ بلند دوہراتے، پھر آگے اور بڑے مکبّروں کا وسیع تر دائرہ ہوتا اور وہ بات کو آگے پہنچاتے۔

خطبۂ حجۃ الوداع ایک ایسی عظیم الشان بین الانسانی دستاویز ہے جو نہ صرف اپنے دور میں آگے یا پیچھے کوئی مثال نہیں رکھتی، بلکہ آج بھی انسانیت کے پاس ایسا عظیم منشورِ حقوق موجود نہیں ہے جسے دینی تقدس کے ساتھ نافذ کرنے کے لیے ایک عالمی جماعت یا اُمت کام کرنے کے لیے تیار کی گئی۔ اس کے بعض اجزا جدید دور میں دوسروں کی دستاویزات میں بھی ملتے ہیں، مگر ان کاغذی پھولوں میں عمل کی خوشبو کبھی پیدا نہ ہو سکی۔ پھر خطبۂ حجۃ الوداع کے اساسی عقائد کے علاوہ بعض اہم اجزا ایسے ہیں جن کی قدر و قیمت سے ہماری آج کی روشن دماغ دنیا آشنا ہی نہیں۔

خطبۂ حجۃ الوداع نہایت ہی خوبی سے اس حقیقت کو اجاگر کر دیتا ہے کہ اب تک کے دو تین ہزار سالہ دورِ تاریخ میں حضورؐ پیغمبرِ آخر الزماں وہ پہلی مبارک شخصیت ہیں جو ساری انسانیت کے لیے وسیع اور جامع پیغام لے کے آئے اور اس پیغام کو ایک تحریک کی شکل میں جاری کیا، اس پر مبنی ریاست قائم کی۔ اور اسے دنیا کی تمام اقوام تک پہنچانے کے لیے شہداء علی الناس کی ایک جماعت قائم کی۔

اب ہم اس عظیم الشان خطبے کے اہم اجزا کا ذکر کرتے ہیں:

حجۃ الوداع کے موقع پر خطبۂ عرفات کے علاوہ منیٰ میں بھی آپؐ نے تقریر فرمائی۔ مختلف خطبوں میں یہ باتیں ارشاد فرمائیں:

"لوگو! میری بات غور سے سنو، شاید اس سال کے بعد اس مقام پر میں پھر تم سے کبھی نہ مل سکوں۔"

"جاہلیت، یعنی غیر اسلامی زندگی کے تمام دستور میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔" (یعنی ان کو ختم کیا جا رہا ہے۔)

"اے انسانو! تمہارا ربّ بھی ایک ہے اور تمہارا ابّ بھی ایک ہے۔"

یعنی انسانیت کا اتحاد وحدتِ ربّ اور وحدتِ اب، یا وحدتِ اِلٰہ اور وحدتِ آدم کی بنیاد پر قائم ہو سکتا ہے۔

"کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر، نہ سرخ کو سیاہ پر اور نہ سیاہ کو سرخ پر۔ فضیلت کوئی ہے تو فقط تقویٰ سے ہے۔"

یعنی نسل و رنگ اور وطن و علاقہ کسی بڑائی کی بنیاد نہیں ہیں، بڑائی کا ذریعہ اگر کوئی ہے تو ایمان اور کردار ہے۔

"ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔"

یعنی اسلام ایک نظامِ اخوّت ہے اور مسلمانوں کی بنائے اجتماع اور بنائے اخوّت سوائے اسلام کے کچھ نہیں۔ ان کو حق نہیں کہ وہ وطن اور نسل اور قبیلے اور علاقے اور رنگ کی بنیاد پر جمع ہونے کے لیے ایک دوسرے کو پکاریں۔

لوگو! اُس آخری وقت تک جب تم اپنے ربّ سے جا ملو، تمہارے خون اور تمہارے اموال ایک دوسرے پر حرام ہیں (قابلِ تحفظ ہیں) جیسے تمہارے اس دن کی حُرمت ہے اور جیسے تمہارے اس مہینے کی حُرمت ہے اور جیسے تمہارے اس شہر کی حُرمت ہے۔"

"ہاں تمہارے غلام! تمہارے غلام! جو کچھ خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ اور جو خود

پہنو وہی ان کو پہناؤ۔"

یعنی جن لوگوں کو خدمت میں لیا جائے۔ ان کو اپنی طرح یا گھر کے ایک رکن کی طرح رکھنا چاہیے اور مساویانہ قسم کا کھانا اور لباس اُنھیں دینا چاہیے۔

"اور جاہلیت یعنی غیر اسلامی دور کے تمام خون (جن سے سلسلۂ انتقام چلتا ہے) کالعدم کر دیے گئے اور سب سے پہلے میں ربیعہ ابنُ الحرث کے بیٹے کے خون کو کالعدم قرار دیتا ہوں۔"

یعنی حضورؐ نے اس قانون کے اجرا کا آغاز اپنے اقربا سے فرمایا۔

"اور دورِ جاہلیت کے تمام سُود ختم کیے جاتے ہیں، اور سب سے پہلے میں اپنے ہی خاندان میں سے عباس بن عبدالمطلب کا سُود ختم کرتا ہوں۔" اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ سُود نہیں رہے گا۔

یعنی اسلام سے پہلے سود کا جو دور دورہ تھا، اس کے تحت جن لوگوں کی سُود کی رقمیں دوسروں کے ذمے ہیں، ان پر خطِ تنسیخ کھینچا جاتا ہے۔

"اے انسانو! تم اپنی خواتین پر حق رکھتے ہو، اور خواتین تم پر حق رکھتی ہیں۔ تمھاری طرف سے اُن پر لازم ہے کہ وہ تمھاری خواب گاہوں میں کسی غیر کو نہ آنے دیں۔ جبکہ یہ بات تمھارے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ اور خواتین پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ کسی کھلے کھلے فحش امر کا ارتکاب نہ کریں۔ اور اگر وہ ان غلط چیزوں کا ارتکاب کریں تو تم (تادیباً) اُنھیں اپنی خواب گاہوں سے الگ کر سکتے ہو۔ اور صرف اس حد تک سختی کر سکتے ہو کہ ان کے بدن پر کوئی نشان نہ پڑے۔ پھر اگر وہ غلط روش سے بچیں تو معروف معیار اور طریقے کے مطابق ان کے نان ونفقہ کی ذمہ داری تم پر ہے۔"

"خواتین کے بارے میں مَیں تمھیں وصیت کرتا ہوں کہ ان کے ساتھ بھلائی کا رویّہ اختیار کرو، کیونکہ وہ تمھارے زیرِ قیادت رکھی گئی ہیں۔ وہ اپنے لیے ازخود کچھ نہیں کر سکتیں۔ اور تم نے اُنھیں اللہ کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے۔ اللہ کے کلمات یا قوانین کے تحت ان سے بدنی وابستگی کا جواز حاصل کیا ہے۔"

یعنی مردوں کا یہ مقام نہیں کہ ان کو بھیڑ بکری سمجھیں، بلکہ سارا معاملہ اللہ کے قوانین کے تحت ہونا چاہیے اور ان سے بھلائی کا برتاؤ کرنا چاہیے۔

"اے لوگو! میرے بعد کوئی نبی نہیں، اور نہ تمھارے بعد کوئی نئی اُمت نمودار ہونے والی ہے۔ پس اپنے رب کی پرستش کرو، نماز پنجگانہ ادا کرو، ماہِ رمضان کے روزے رکھو، اپنے اموال کی زکوٰۃ پاکیزگیٔ دل کے ساتھ ادا کرو، اپنے رب کے گھر کا حج کرو، اور اپنے اربابِ قیادت کی اطاعت کرو۔ تاکہ خدا کی جنّت میں تمھارا داخلہ ہو۔"

"اگر نکٹا حبشی بھی تم پر امیر ہو اور وہ تم کو خدا کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔"

"میں نے تمھارے درمیان وہ چیز چھوڑی ہے جس کا سر رشتہ اگر مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو تم آخر دم تک کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ وہ ہے خدا کی کتاب اور اس کے نبی کی سُنت"۔ پھر فرمایا: "اے اللہ میں نے بات پہنچا دی۔ اے اللہ تو گواہ رہ کہ میں نے بات پہنچا دی۔" لوگوں نے پکار کر کہا: "ہم شہادت دیتے ہیں آپ نے پیغام پہنچا دیا۔" پھر فرمایا: "جو یہاں موجود ہیں وہ ان لوگوں تک یہ باتیں پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔"

خطبے کے بعد نماز ادا فرمائی۔ پھر مُوقّف میں تشریف لا کر جبل مشاۃ کے سامنے قبلہ رُد ہوئے اور شدید گریہ و زاری کے ساتھ غروبِ آفتاب تک دُعا فرماتے رہے۔

اسی مقام پر مشہور آیت نازل ہوئی، الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔[1] اس آیت کا واضح اشارہ یہ تھا کہ محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کو جس مقصد کے لیے دنیا میں بھیجا گیا تھا، وہ پورا ہو چکا اور جو احکام خدا کی طرف سے آنے تھے آ چکے۔

بعد ازاں حضور نے حج کے بقیہ مناسک و مراحل کی تکمیل کی۔ قربانی کے لیے یمن سے حضرت علیؓ رسولِ خدا کے لیے سو اُونٹ لائے تھے۔ حضورؐ نے ۶۳ اُونٹ اپنے

---

[1] المائدہ ۳

دستِ مبارک سے نحر کیے، بقیہ کو حضرت علیؓ کے سپرد کیا۔
۱۳، اور ۱۴ ذی الحجہ کی درمیانی رات کو پچھلے پہر مکّہ تشریف لائے۔ طوافِ وداع کیا اور نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد مہاجرین و انصار کے ساتھ مدینے کو مراجعت فرمائی۔ ∞

تقریر ۳۶

اللھم الرفیق الاعلیٰ

حجتہ الوداع کے موقع پر خطبے میں حضورؐ کا یہ فرمانا کہ میں شاید اس سال کے بعد اس جگہ تم لوگوں سے دوبارہ نہیں مل سکوں گا۔ اور یہ فرمانا کہ اے اللہ گواہ رہیو کہ میں نے بات پہنچا دی، نیز یہ وصیت فرمانا کہ تمھارے درمیان کتاب و سُنت کو چھوڑے جا رہا ہوں، جب تک ان کا رشتہ تھامے رکھو گے، کبھی گمراہ نہ ہو گے اور اس آیت کا نزول کہ الیوم اکملت لکم دینکم اور رحلت سے ۳ ماہ پہلے سورۂ نصر کا نازل ہونا، یہ سب ایسے اشارات تھے جن سے ظاہر تھا کہ خدا کا سفیر، دینِ حق کا نقیب ملّتِ اسلامیہ کا پیشوا، تاریخ کا قافلہ سالار، تہذیب کا معمار اور انسانیت کا محسن عنقریب جدا ہونے والا ہے۔ بلکہ حجتہ الوداع سے واپس مدینے آتے ہوئے غدیرِ خُم کے مقام پر صاف فرمایا کہ میں بھی انسان ہوں اور شاید میرے پاس خدا کی طرف سے قاصد جلد آجائے۔

خطبۂ غدیرِ خُم میں آپؐ نے یہ بھی فرمایا ''میں ذمہ داری کے دو بوجھ تمھارے درمیان چھوڑے جا رہا ہوں۔ ایک خدا کی کتاب جس میں ضابطۂ ہدایت اور روشنی اور حکمت ہے،

سو خدا کی کتاب کو تھام لو اور اسی سے رہنمائی حاصل کرو۔ پھر فرمایا۔ اور دوسرے میرے گھر کے لوگ ہیں۔ اپنے گھر کے لوگوں کے بارے میں میں تمھیں خدا ہی کی یاد دلاتا ہوں۔"

منشا صاف تھا کہ ساری بات حضورؐ اپنے بعد کے دور کے لیے بطورِ وصیت کر رہے تھے۔ پہلی وصیت کتاب اللہ کو ضابطۂ حیات بنانے کی تھی، اور دوسری وصیت یہ کہ میرے گھر کے لوگوں کا خیال رکھنا۔ حضورؐ کے گھر کے لوگوں نے ساری عمر بس فقر و فاقہ میں گزاریں اور حضورؐ کی طرف سے نہ ان کے لیے کوئی جائیداد بنائی گئی، نہ کوئی خزانہ جمع ہوا اور نہ ان کے لیے خصوصی مفاد اور حقوق اور تحفظات مقرر کیے گئے۔ حضورؐ نے خود تو تمام حقوق و مفاد کی قربانی دی تھی، ساتھ ساتھ اہلِ خاندان کو بھی دولت سمیٹنے اور فائدے اٹھانے سے باز رہنے کی تربیت دی۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ نے اپنی جماعت کو یہ توجہ دلانا مناسب سمجھا کہ میرے خاندان اور گھر والوں کا خیال رکھنا بھی تمھاری ذمہ داری ہے کیونکہ حضورؐ کے اہلِ خاندان آپؐ کی نجی زندگی کے شاہد اور آپؐ کے معمولات کو قریب سے دیکھنے والے اور براہِ راست حضورؐ سے تعلیم و تربیت پانے والے تھے، اس لیے وہ اُمت کے لیے تعلیمِ دین کا ایک قیمتی ذریعہ بھی تھے۔ اُن کا خیال رکھنا اُمت کے لیے اس وجہ سے بھی لازم تھا کہ وہ حضورؐ کے اقربا کو پریشان حالی میں چھوڑ کر ان کے معلّمانہ و مربّیانہ فیوض سے محروم نہ ہو جائیں۔

اس خطبہ کا ایک اور پہلو بھی قابلِ توجہ ہے۔ حضرت علیؓ کے ساتھ جو صحابہ یمن بھیجے گئے تھے، اُنھیں تقسیم غنائم کے سلسلے میں حضرت علیؓ سے اختلاف ہو گیا تھا۔ ایسا ہونا بالکل قرینِ قیاس ہے کہ جب کسی بڑے کام کے لیے مختلف دائروں سے آ آ کے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں تو مزاجوں کے فرق اور رایوں کے اختلاف کے مواقع بار بار پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی کبھار کسی بحث میں تلخی آجاتی ہے اور اختلاف تکدر کا باعث بن جاتا ہے۔ آخر انسانی فطرت اپنے گوناگوں داعیات و محرکات سے خالی ہو کر بالکل سپاٹ کیسے بن سکتی ہے، اور انسان مشینوں کا روپ کیونکر دھار سکتے ہیں۔ اسی لیے بڑے بڑے کام کرنے والوں کو ناگواریوں کے باوجود ایک دوسرے سے سازگاری کرنی پڑتی ہے۔

صحابۂ کرام کی مثال تاریخ میں کہاں ملے گی کہ ان میں باہم کبھی تکدر کا کوئی لمحہ آیا بھی تو اُنہوں نے فوراً اس پر قابو پالیا۔ اُوپر جس واقعے کا اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے سلسلے میں اختلاف کا اثر اتنا شدید تھا کہ بریدہ اسلمی نے رسولِ خدا سے حضرت علیؓ کے خلاف شکایت کردی، ہوسکتا ہے کہ حضرت علیؓ نے کچھ تذکرہ کیا ہو۔ اس سے حضورؐ کو دلی اذیت ہوئی۔ اور اسی حالت میں لوگوں سے خطاب کیا اور کسی کا نام لیے بغیر کہا کہ :

"جس کا میں رفیق ہوں، علیؓ بھی اُس کا رفیق ہے۔ اے اللہ! جو علیؓ کو دوست رکھے تو بھی اس کو دوست رکھ، اور جو علیؓ سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ"

بات صاف تھی کہ حضرت علی ہم سابقون الاولون میں سے تھے، بے شمار اہم امور انجام دے چکے تھے، کتنے ہی کارنامہ ہائے جہاد ان کے حصے میں آئے، علم اور خصوصاً علم قضا میں مہارت رکھتے تھے، پھر حضورؐ اور حضرت علیؓ ایک ہی دعوت کے داعی اور ایک ہی مشن کے علمبردار تھے۔ ان کا آپس میں رشتہ بھی ایسا تھا کہ حضرت علیؓ گویا بمنزلہ اولاد تھے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک سے تو محبّت رکھی جائے اور دوسرے سے تکدر ہو۔ بلکہ مقدّس مقصد کی وحدت کا رشتۂ اخوّت تمام صحابۂ کرام میں ایک دوسرے کے ساتھ ایسا ہی تھا کہ یہ قابلِ تصوّر نہ تھا کہ ایک سے وابستگی ہو اور دوسرے سے دوری۔ حضورؐ کو رنج اس بات سے ہوا کہ اسلام کے عظیم نصب العین کے بہترین علمبردار راہیوں کے اختلاف کو تکدر تک پہنچانے لگیں تو کام کیسے چلے گا۔ اس کیفیت کے زیرِ اثر آپؐ نے جماعت کو ڈانٹ دینا مناسب سمجھا۔

غدیرِ خم کے خطاب میں حضرت علی مرتضیٰ کے لیے جو پیارے الفاظ حضورؐ نے استعمال فرمائے۔ ان پر حضرت عمرؓ فاروق نے حضرت علیؓ کو مبارکباد کہی۔ دوسری طرف بریدہ اسلمی تھے جنھوں نے بعد کی ساری عمر میں حضرت علی مرتضیٰ سے محبت اور متابعت کا تعلق رکھا۔

بس یہی تھی اصل بات۔ اِس موقع پر جانشینی وغیرہ کا کوئی مسئلہ نہیں چھڑا تھا۔

ماہِ صفر ۱۱ھ کے آغاز ہی سے سفرِ آخرت کے لیے حضور محسنِ انسانیت کی روحِ پاک نے تیاریاں شروع کر دیں۔ ایک روز اُحد تشریف لے گئے اور شہداءِ اُحد کے لیے سربسجود ہو کر دُعا کی۔ واپس تشریف لائے تو یہ خطبہ دیا۔

"لوگو! میں تم سے پہلے رُخصت ہونے والا ہوں، اور خدا کے سامنے تمھارے متعلق شہادت دینے والا ہوں۔ میں حوضِ کوثر کو یہاں سے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے یہ اندیشہ نہیں کہ تم میرے بعد مشرک ہو جاؤ گے۔ ڈر یہ ہے کہ دنیوی مفاد کی کشمکش میں نہ پڑ جاؤ۔"

پھر آدھی رات کو گورستانِ بقیع میں جا کر اہلِ قبور کے لیے دعائے مغفرت فرمائی اور فرمایا کہ ہم بھی تم سے جلد ہی آ کر ملنے والے ہیں۔

پھر ایک دن بطورِ خاص اپنے رفیقانِ تحریکِ حق سے خطاب کیا۔ مخاطبین کے لیے دعاؤں سے آغاز کیا۔ وصیت کی کہ: اللہ کی بستیوں میں اس کے بندوں کے درمیان تکبر اور سرکشی کی روش اختیار نہ کرنا۔

گورستانِ بقیع سے واپسی پر ہی ہلکا ہلکا دردِ سر شروع ہو گیا تھا۔ پھر ماہِ صفر کی انتیسویں تاریخ کو ایک جنازے کے ساتھ جانے اور آنے کے دوران میں درد میں شدّت پیدا ہوئی۔ مرض کے ابتدائی ہلکے حملے کے دوران میں گیارہ روز تک مسجد میں تشریف لا کر خود ہی نماز کی امامت فرماتے رہے۔ شدّتِ مرض کی وجہ سے بالکل صاحبِ فراش ہو جانے کی مدّت ایک ہفتہ ہے۔ تکلیف بڑھنے پر ازواجِ مطہرات سے اجازت لے کر حضرت عائشہؓ ہی کے حجرے میں آ گئے۔

حالتِ مرض میں بھی تحریک اور ریاست کے معاملات پر نظر تھی۔ ۲۶ صفر کو غزوۂ روم کی تیاری کا حکم دیا اور دوسرے دن حضرت اسامہ بن زید کو اس مہم کا افسرِ اعلیٰ مقرر کیا۔ حضرت اسامہ کی کم عمری اور کچھ سماجی مرتبے کی بنا پر یہ چہ میگوئیاں ہوئیں کہ بڑے بڑے انصار و مہاجرین کے ہوتے ہوئے ایک لڑکے کو امیر مقرر کیا گیا ہے۔ حضورؐ نے خطاب فرمایا جس کا زوردار جملہ یہ تھا:

"زید بن حارثہ بھی ہم کو سب سے زیادہ محبوب تھا، اور اُس کے بعد اس کا بیٹا (یعنی اسامہ بن زید) بھی ہمیں سب سے زیادہ محبوب ہے۔"

وفات سے ۵ یوم پہلے بدن پر سات مشک پانی ڈلوایا۔ اس غسل سے طبیعت ذرا ہلکی ہوئی تو سہارا لے کر مسجد تشریف لے گئے اور وہاں اپنے رفیقوں سے یوں خطاب کیا۔

"تم سے پہلے ایسے لوگ گزرے ہیں جنھوں نے انبیاء وصلحا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا، تم ایسا نہ کرنا۔ میری قبر کو میرے بعد سجدہ گاہ نہ بنا لینا۔"

پھر نماز پڑھائی اور نماز کے بعد فرمایا۔

"میں تم کو انصار کے حق میں خاص تاکید کرتا ہوں۔ یہ لوگ میرے جسم کے پیرہن اور میرے لیے زادِ راہ رہے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے حصے کی ذمہ داریاں پوری کر دیں، اور اب تم پر اُن کی ذمہ داریاں باقی ہیں۔"

پھر فرمایا۔

"خدا نے اپنے بندے کو اختیار دیا کہ وہ چاہے تو دنیا ومافیہا کو قبول کرلے اور چاہے تو وہ کچھ قبول کرے جو خدا کی بارگاہ میں ہے۔ سو بندے نے وہی کچھ انتخاب کر لیا جو اس کے لیے خدا کی بارگاہ میں ہے۔"

اس اشارے کو سمجھنے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ پیش پیش تھے۔ وہ حضورؐ کا یہ ارشاد سُن کر زار و قطار رونے لگے۔

نماز کی جماعت میں شرکت سے جب معذوری ہو گئی تو حضرت سیدنا صدیقؓ کو اپنی جگہ امامت پر مامور فرما دیا۔ اب مرض کی شدت کے اس حد تک بڑھنے سے جماعت میں اضطراب پھیلا۔ لوگ بار بار مسجد کا چکر لگاتے۔ جماعت کو تسکین دلانے کے لیے حضورؐ باہر تشریف لائے۔ آپؐ نے حضرت علیؓ اور حضرت فضل ابن عباس کے کندھوں کا سہارا لیا اور قدم گھسیٹتے ہوئے مسجد میں تشریف لائے۔ حضرت صدیقؓ نماز پڑھا رہے تھے۔ حضورؐ کی آمد کا احساس کر کے پیچھے ہٹنے لگے، مگر حضورؐ نے اشارہ کیا کہ وہ بدستور اپنی جگہ پر رہیں۔ مگر ان کے ساتھ ہی بیٹھ کر نماز ادا فرمائی۔ بعد میں منبر کے نچلے زینے پر بیٹھ کر آخری خطاب فرمایا۔

"لوگو! مجھے خبر ملی ہے کہ تم میری موت سے ڈرتے ہو۔ جتنے بھی انبیا مبعوث ہو چکے ہیں، کیا کوئی بھی اُن میں سے ہمیشہ زندہ رہا۔ میں خدا سے ملنے والا ہوں اور تم بھی خدا سے ملنے والے ہو۔ میں وصیت کرتا ہوں کہ انصار کے ساتھ بھلائی کرنا۔ میں وصیت کرتا ہوں کہ مہاجرین آپس میں حسنِ سلوک کریں۔"

پیر کے روز مزاجِ اقدس نے آخری بار سنبھالا لیا۔ مسواک کی۔ پردہ اُٹھا کر صحابہ کی جماعت کو دیکھا اور مسکرائے۔

اس کے چند ہی لمحوں بعد ہاتھ اُٹھا کر اللّٰھم الرفیق الاعلیٰ یا فی الرفیق الاعلیٰ تین بار فرمایا۔ سیدہ عائشہ صدیقہ کی آغوش میں سر رکھے رکھے خدائے حیّ و قیوم سے جا ملے۔ یہ ۱۲ ربیع الاوّل[1] دوشنبہ کا دن تھا۔ چاشت کا وقت تھا۔ حضورؐ کی عمرِ مبارک قمری حساب سے ۶۳ سال ۴ دن بنتی ہے۔

آج وہ ہستی دنیا سے رُخصت ہو رہی تھی جس نے زندگی کے قافلے کو رہزنوں کے نرغے سے نکال کر صراطِ مستقیم پر لانے کے لیے خوفناک اذیتیں اور مشقتیں برداشت کیں۔ یہ کتنا بڑا سانحہ تھا عمر بھر کے اقربا و رفقا کے لیے! ان کی نگاہوں میں زمین و آسمان گھوم گئے ہوں گے۔ حضرت عثمانؓ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ حضرت علیؓ بے حس و حرکت ہو گئے۔ حضرت عبداللہؓ بن اُنیس کا دل شق ہوا اور صدمے سے انتقال فرما گئے۔ حضرت عمرؓ چند لمحوں کے لیے عقلی توازن کھو بیٹھے۔

حضورؐ کے جانے سے کتنا بھاری خلا پیدا ہو گیا تھا۔ حضورؐ کی تیار کردہ جماعت نے اپنے احساسِ ذمہ داری اور بے مثل مضبوطیٔ کردار کا ثبوت یوں پیش کیا کہ فوراً قیادت کے خلاء کو پُر کر لیا۔ اور اس نازک مرحلے پر کوئی رسہ کشی اور کنویسنگ نہیں ہوئی۔

یہ ہے داستان اس ہستیٔ درخشاں کی جس کے پوری انسانیت پر عمومی احسانات

---

[1] تاریخ وفات کے سلسلے میں مورخین اور سیرت نگاروں میں اختلاف ہے۔ مگر بہرحال مشہور عام یہی تاریخ ہے۔

ہیں، اور ہمارے لیے خصوصی۔ ہم اس آخری پیغمبرِ برحق کی اُمت میں ہیں۔ ہمارے رسولِ مقبول نے ہماری خیر و فلاح کے لیے طرح طرح کے دُکھ اُٹھائے، بے شمار قربانیاں دیں اور ان کا کوئی صلہ نہ مالی شکل میں وصول کیا نہ اپنے لیے اور اپنی نسل کے لیے ترجیحی حقوق کی شکل میں۔

پس ہم حضورؐ کی مہربانیوں اور جانفشانیوں کا کوئی جواب اس کے سوا دینے کے قابل نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کریں کہ وہی اپنے خزانہ ہائے رحمت سے بہت بڑا حصہ حضورؐ کو عطا کرے۔ اسی مقصد سے ہم درود شریف پڑھتے ہیں۔

اللھمّ صلی علی سیّدنا و مولٰنا محمد و علیٰ آلہ و بارک وسلم!



کتاب پڑھنے کے بعد!

محترم و عزیز قاریان!

کتاب آپ نے پڑھ لی۔ اب ذرا اپنے ذہنی تاثرات اور قلبی کیفیات کو سمیٹ کر غور فرمایئے کہ آپ نے اس سے کیا اخذ کیا؟

مؤلف اپنی طرف سے یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ میں نے اپنی یہ ناچیز کوشش دینوی مفاد کو سامنے رکھ انجام نہیں دی، یہ میرے ضمیر کے تقاضوں اور ایمانی ولولوں کا ایک بے ساختہ اظہار ہے۔ یہ کوئی تفریحی کتاب نہیں، اس کا مقصد قاری کی وقت گزاری نہیں۔ بلکہ میں نے نبئ اکرمؐ کے متعلق یہ جانا اور مانا کہ جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلّم سے درخشاں تر شخصیت کوئی نہیں، حضورؐ کے کلمۂ دعوت سے عظیم تر کوئی دعوت نہیں، آپؐ کی دی ہوئی خدائی ہدایت سے ہٹ کر کوئی راستہ ہدایت و سلامتی کا نہیں، آپ کی تحریک سے زیادہ انسانیت کیلئے ذریعۂ فلاح و سعادت کوئی نہیں، آپؐ کے تعمیر کردہ نظام سے زیادہ عدل اور امن کا کسی نظام میں امکان نہیں اور آپؐ کے تیار کردہ انسانوں سے بڑھ کر اصحابِ شرف و کرامت

اور آپ کے برپا کردہ معاشرے سے زندہ تر معاشرہ اور کوئی نہیں۔

اس روشن شخصیت کو سمجھنے میں مجھے خاصی دیر لگی۔ عمر کے متعدد سال ایسے گزر گئے کہ جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی و ہادی تو مانتا تھا اور سب کی طرح کلمہ پڑھتا تھا، مگر حضورؐ کی حقیقی دعوت، حضورؐ کے کارنامے اور حضورؐ کی بین الانسانی عظمت کا پورا شعور مجھے ایک مدت کے مطالعہ و تفکر کے بعد حاصل ہوا۔

پھر میں نے چاہا کہ جس بڑی حقیقت کو میں نے سمجھا ہے اسے دوسروں تک بھی اس کی صحیح شکل میں پہنچاؤں۔ اس کا بہت پہلے سے کوئی ارادہ میرے اندر نہ تھا یکایک کچھ تحریک ہوئی اور خدا تعالیٰ نے اپنے خاص کرم سے ایک مصروف اور غیر صحت مند انسان سے اپنے پیارے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں یہ کتاب لکھوالی۔ اس میں جو غلطیاں یا کوتاہیاں ہیں اُن کا ذمہ دار میں ہوں اور خدا سے عفو کی درخواست کرتا ہوں اور اس میں خیر و خوبی جو کچھ ہے وہ اللہ کی عنایت سے ہے، سو اس کا شکر گزار ہوں اور اس سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اسے قبول فرما کر مجھے اپنی بخشش سے نوازے۔

اب آپ سے میری درخواست یہ ہے، خصوصاً میں نوجوان نسل سے کہنا چاہتا ہوں کہ تمام فلسفوں اور نظریوں کی گرد خیال کے دامنوں سے جھاڑ کر حضورؐ کے دامانِ دعوت کو تھام لیں۔ چھوٹے چھوٹے مفادات اور مادی مقاصد کو درکنار رکھ کر اس بڑے کام کے لیے اٹھیں کہ فلاحِ انسانیت کی جو تحریک خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے چلائی تھی اس کا آغاز آپ بھی کریں اور اگر کام پہلے سے ہو رہا ہو تو اس کا ساتھ دیں۔ تمام گروہ بندیوں کو بھول جائیں، علاقوں اور نسلوں کے مفاد کے جھگڑے دوسروں کے لیے چھوڑ دیں، ماحول کی ناسازگاریوں کے درمیان تن تنہا اُٹھ کھڑے ہوں، اکثریت کی مخالفانہ روش کی پروا نہ کریں، روپے اور دولت اور آسائشوں کا جو موسم بہار ہر طرف چھایا ہوا اس کے گل و لالہ کو آپ اُن کانٹوں پر قربان کر دیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریکِ اقامتِ دین کے صراطِ مستقیم پر پھیلا دیے گئے ہیں، آرٹ اور کلچر کے شعبدوں سے مسحور نہ ہوں، مادہ پرست تہذیب کے پروپیگنڈے کے جالوں کی

ڈوریاں اپنے دلوں تک نہ پہنچنے دیں، سپر پاورز کے شان و شکوہ سے مرعوب نہ ہوں۔ اور ان کی طرف سے مکر و سازش کے جو جھکڑ اُٹھ رہے ہیں اور ان کے ظلم و جارحیت کی وجہ سے جا بجا انسانی خون کی جو ہلاکت انگیز برکھا ہو رہی ہے اسے دیکھ کر اپنے اندر کسی خوف اور دہشت اور مایوسی کو جڑ نہ پکڑنے دیں، بلکہ جو مشن حضورؐ کی میراث میں آپ کو ملا ہے اور جس کی خدمت کر کے ہی آپ آخرت میں حضورؐ کی شفاعت کی اُمید کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے جان و مال، دماغ اور دل، زبان اور قلم کی ساری قوتیں کھپا دیں۔

خدا کے پیغمبروں (علیہم السلام) پر ایمان لانے کا تقاضا بس اتنا ہی نہیں ہے کہ اُن سے محبت و عقیدت کا اظہار کر دیا جائے، یا نظم و نثر میں ان کی شان میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر قصیدے کہے جائیں، نہیں، بلکہ پیغمبروں پر ایمان کا اصل مطالبہ یہ ہے کہ ان کی اطاعت کی جائے۔ اصل اطاعت بھی اتنی محدود نہیں کہ امورِ زندگی کے جزئیات میں اپنے نبیؐ کی تعلیمات سے احکام اخذ کیے جائیں، بلکہ بڑی اور مرکزی اطاعت یہ ہے کہ جس عقیدے کو لے کر جس طرح کی تنظیم حضورؐ قائدِ انسانیت نے بنائی، پھر جس طرح کی انقلابی تحریک آپؐ نے چلائی اور بالآخر جس طرح کا نظامِ حیات آپؐ نے قائم فرمایا، اس ساری وسیع سُنت کی اطاعت کی جائے۔ افسوس یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں اطاعت کرنے والوں کی بھی زیادہ تعداد ایسی ہے جو چھوٹی سے چھوٹی سُنت پر زور دینے کے باوجود اُس بڑی سُنت سے غافل ہے جس کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے۔

میں اپنی کتاب کے خوانندگان ——— اور اُن میں خصوصاً نوجوانوں ——— سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ حضورؐ کی دعوت، حضورؐ کے کردار، حضورؐ کی تنظیم، حضورؐ کے رفقاء، حضورؐ کی تحریک اور اس کے جملہ مراحل و مسائل کا نہ صرف اس کتاب کے ذریعے بلکہ دوسری بے شمار کتبِ تفسیر و حدیث و سیرت کی مدد سے گہرا شعور حاصل کریں، اور پھر حضورؐ کے بتائے ہوئے بھاری کام کو کرنے کے لیے جذبۂ جہاد کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوں۔

آج سب سے بڑی سعادت یہ ہے کہ موجودہ دور پر پوری طرح مسلّط طاغوتی

تہذیب اور اس کے صنم خانوں کے دیوتاؤں کی خدائی کو چیلنج کیا جائے اور انسانیت کو اس کی گرفت سے نکالا جائے۔ دوسرے تمام مذاہب کے علمبردار طاغوتی تہذیب اور اس کے دیوتاؤں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اس کے لونڈی غلام بن چکے ہیں۔ اب ساری امیدوں کا مرکز صرف مسلم قوت رہ گئی ہے۔

کیا آپ وہ مسلم قوت بنیں گے جو انسانی فلاح کے لیے اس دجالی دور کو چیلنج کرنے کے لیے میدان میں آئے؟

اگر آپ کا جواب اثبات میں ہو تو اس کتاب کے لکھنے کا مقصد پورا ہوا۔ ورنہ میری نگاہ میں ایسا ایک فرد بھاری قدر و قیمت رکھتا ہے جو سرکارِ رسالتمآب کے مردآفگن "مشن" کا سچا وارث بن کے اُٹھے۔

میری ساری محبت، اور میری ساری دلی دُعائیں اور فرشتوں کی مسرتیں اور انبیاء کی بشارتیں اس کے ساتھ ہیں!

نعیم صدیقی

۱۱ شوال ۱۴۰۲ھ

یکم اگست ۱۹۸۲ء